یکم مئی ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۹

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

...اور حوصلہ جیت گیا!

محمد ابراہیم خان

دشمن نے جو کچھ بھی سوچا تھا، وہ خام خیالی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لڑائی کیا شروع ہوئی، دشمن کے لیے ذلت کا بازار سجنے لگا۔ برسوں بلکہ عشروں کے دوران پروان چڑھایا جانے والا غرور خاک میں مل گیا۔ ملنا ہی تھا کیونکہ غرور کا مطلب ہے دھوکا، وہ دھوکا جو کوئی اپنے آپ کو دے۔ بھارت کی قیادت ایک مدت سے خوش فہمیوں کا جُھولا جُھول رہی تھی۔ طاقت کا زعم بہت زیادہ تھا۔ رقبے اور آبادی میں بڑا ہونے کو طاقت سمجھ لیا گیا تھا۔ کسی بھی زمانے میں طاقت کا تعلق حجم سے نہیں رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے ہندوستان پر کبھی حکومت نہ کی ہوتی۔

مودی جی نے سِندور چاٹ لیا؟

چار روزہ جنگ کے نتیجے میں بھارت کو جو کچھ جھیلنا پڑا ہے، اُس نے بھارتی توپوں کے ساتھ ساتھ نریندر مودی کو بھی خاموش کرا دیا ہے۔ پہل گام میں سیاحوں کے قتل کا بدلہ لینے کے نام پر بھارت نے 'آپریشن سِندور' کی لانچنگ کی۔ سِندور سُہاگ کی علامت ہے۔ بھارتی سُورما پاکستان کی مانگ میں سِندور بھرنا چاہتے تھے۔ سِندور چاٹنے سے گلا بیٹھ جاتا ہے۔ مودی جی نے جنگ کے دوران کچھ بھی بولنے سے گریز کیا۔ ایسا لگتا تھا پاکستانی فوج نے جناب کو سِندور چٹا دیا! قوم سے خطاب تو بہت دور کی بات رہی، بھارتی وزیر اعظم کو فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کچھ کہنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ جنگ بندی میں توسیع کے موقع پر مودی نے قوم سے خطاب بھی کیا تو لہجہ شکست خوردہ اور نیم دلانہ بڑھک سے معمور تھا۔

مغربی ٹیکنالوجی پر بھروسا

بھارتی قیادت کو یقین تھا کہ جنگ کا میدان سجا تو پاکستان کو چند ہی گھنٹوں کی مار سمجھئے۔ اُسے مغرب کی دی ہوئی دفاعی ٹیکنالوجی، جنگی ساز و سامان اور ہتھیاروں پر بھروسا تھا۔ دنیا بھر سے طیارے، ڈرون اور دیگر پروجیکٹائل حاصل کر کے اُن کا بڑا ذخیرہ تیار کیا گیا تھا۔ بھارتی قیادت اور فضائیہ، دونوں ہی کو فرانس کے دیے ہوئے رافیل لڑاکا طیاروں پر حد سے زیادہ بھروسا تھا۔ بھارت کا میزائل ڈیفنس سسٹم بھی بھارت کے اعتماد میں بہت زیادہ اضافے کا ذریعہ تھا۔ دوسری طرف پاکستانی شاہینوں کا بھروسا اول و آخر اللہ کی رحمت پر تھا۔ بھارتی قیادت بھول گئی تھی کہ میدانِ جنگ میں جذبہ لڑتا ہے، ہتھیار نہیں۔ بھارت کی مسلح افواج کو بھی بھگوان سے کہیں زیادہ ہتھیاروں اور دفاعی ٹیکنالوجی پر بھروسا تھا۔ بھارتی فضائیہ یہ سمجھ بیٹھی کہ پاک فضائیہ کو دو تین حملوں ہی میں زیر کر لے گی۔

چار دن کی جنگ کے دوران جو کچھ ہوا، اُس نے بھارت کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اگر بھارتی قیادت بے شرمی سے رونمائی کرتے پھریں تو اور بات ہے۔ عالمی برادری جان چکی ہے کہ بھارت کی بس باتیں ہی باتیں ہیں۔ لڑنے کے لیے جو جذبہ درکار ہوا کرتا ہے، وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔

معاشی قوت

بھارت ایک بڑی منڈی ہے۔ اُس نے اپنے تعلیمی نظام کو مضبوط بنا کر دنیا بھر کے لیے نالج ورکرز بھی بہت بڑی تعداد میں تیار کیے ہیں۔ اِن ورکرز کی بھیجی ہوئی رقوم سے بھارت کا خزانہ بھرا رہتا ہے، تو انا رہتا ہے۔ زرِ مبادلہ کے ذخائر میں پیہم بڑھوتری بھارت میں ایسا اعتماد پیدا کر رہی ہے جو محض دھوکا ہے۔ بھارتی قیادت نے زرِ مبادلہ کے وسیع ذخائر کو فیصلہ کن قوت سمجھ لیا تھا۔ جنگ لڑنے اور جیتنے کے لیے جس عزم اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھارتی قیادت اور مسلح افواج میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔

پڑوسیوں کو دبوچنے کی خواہش

ایک زمانے سے بھارتی قیادت کو اس بات پر یقین رہا ہے کہ وہ جب چاہے گی، اپنے تمام پڑوسیوں کو گردن سے دبوچ کر بٹھا دے گی۔ بنگلا دیش، سری لنکا اور نیپال کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ بھوٹان اور مالدیپ بہت چھوٹے ہیں، اِس لیے اُن کی طرف سے تو کسی بھی قسم کی مزاحمت کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

بھارتی سیاست میں علاقائی صورتحال اور پاکستان سے مخاصمت کو کلیدی کردار حاصل رہا ہے۔ انتہا پسند ہندوؤں نے پاکستان سے مخاصمت کو ووٹ بینک کی مضبوطی کا ذریعہ بنا کر خوب استعمال کیا ہے۔ انتہا پسند ہندو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بنگلا دیش، سری لنکا اور نیپال کی طرف سے کوئی حقیقی خطرہ لاحق نہیں مگر پاکستان تو دردِ سر بنا ہوا ہے۔ سوال اُس سے گلو خلاصی کا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ دو دو ہاتھ کرنے کی ہمت ہے تو نہیں، جان کیسے چُھوٹے۔

اندرونی صفحات پر

- پاکستان: جوہری طاقت کا حصول آسان نہ تھا!
- پروفیسر خورشید احمد: روشن یادیں!
- پروفیسر صاحب کی کشمیر سے قلبی وابستگی
- ڈرنے کا زمانہ گیا!
- پاکستان اور بھارت کے درمیان بے اعتمادی

بھارت ایک عشرے سے بھی زائد مدت سے انتہا پسندوں کے نرغے میں ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے ملک کو اُس مقام پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں سے کئی راستے نکلتے ہیں اور ہر راستہ کسی نہ کسی خرابی کی طرف لے جاتا ہے۔ مغربی دنیا کو اپنا بنا کر بھارت نے علاقے میں برتری کا خواب دیکھا ہے۔ بھارت خطے کا چودھری بن کر تمام چھوٹے پڑوسیوں کو دبا کر رکھنا چاہتا ہے۔ مغربی دنیا بھی یہی چاہتی ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھارت کے راستے کی دیوار کوئی نہ ہو۔ اب اُس کی قسمت کہ پاکستان راہ میں کھڑا ہے۔

ووٹ بینک کی سیاست

مودی سرکار نے کئی بار دہشت گردی کی وارداتیں کروا کے پاکستان کو مطعون کیا ہے اور یوں جنگی جُنون کو پروان چڑھایا ہے۔ جنگی جُنون کو پروان چڑھانے کی بظاہر کوئی ٹھوس وجہ نہیں مگر مودی اور اُن کے ٹولے کی خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طور پاکستان کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ ووٹ بینک مزید دس سال کے لیے مضبوط ہو جائے اور کوئی بھی سیاسی جماعت میدان میں نہ آسکے۔

بھارتی میڈیا ایک زمانے سے انتہائی نوعیت کی ذہنیت کا حامل رہا ہے۔ ویسے تو خیر ہر دور میں پاکستان کو بھارتی میڈیا نے نشانے ہی پر رکھا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ انتہا پسند ہندوؤں کے عہدِ اقتدار میں معاملات بہت تیزی سے بگڑے ہیں یا بگاڑے گئے ہیں۔ مودی سرکار نے اپنے اب تک کے عہدِ اقتدار میں میڈیا کو پاکستان کے خلاف مکمل چُھوٹ دی ہے۔ اِس کے نتیجے میں پوری بھارتی قوم جنگی جنون کے ہاتھوں شدید ذہنی خلجان میں مبتلا کر دی گئی ہے۔ بھارتی میڈیا نے ایک عشرے سے بھی زائد مدت کے دوران پاکستان کو تسلسل کے ساتھ نشانے پر رکھا ہے۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ بھارت کے عوام ہر وقت پاکستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کریں۔ اِسی میں بی جے پی کے ووٹ بینک کے برقرار رہنے کا راز مضمر ہے۔

پاکستان کو دشمن بنائے رکھنے کا نظریہ

پاکستان بجائے خود بھارت کے لیے کوئی بڑا مسئلہ یا دردِ سر نہیں مگر اُس کے پالیسی سازوں نے پاکستانی قیادت اور مسلح افواج، دونوں ہی کے بارے میں اس قدر پروپیگنڈا کیا ہے کہ اب پاکستان محض پڑوسی نہیں بلکہ بھارت کے لیے ایک مستقل دردِ سر ہے، بہت بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ بھارت کے پالیسی ساز پاکستان کو ایک ایسے دشمن کے روپ میں دیکھتے رہے ہیں جس کا خوف پیدا کر کے عوام کے ذہنوں کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ بھارتی عوام کو قدم قدم پر باور کرایا جاتا رہا ہے کہ پاکستان جب تک ہے تب تک بھارت سُکون سے جی نہیں سکتا، اِس لیے اُس کا وجود ختم کرنا لازم ہے۔ سیاست دانوں سے کہیں بڑھ کر بھارتی اسٹیبلشمنٹ کو بھی پاکستان کی شکل میں ایک ایسا دشمن چاہیے جس پر کسی بھی مشکل صورتحال میں الزامات عائد کر کے جان چُھڑائی جاسکے۔ اہلیت کی کمی کو چھپانے کا اِس سے آسان ذریعہ بھلا کیا ہوسکتا ہے؟

بھارت میں جب جب بی جے پی برسرِ اقتدار آئی ہے، پاکستان کو حقیقی دشمن قرار دے کر ہر شعبے میں نیچا دکھانے کی ذہنیت کو پروان چڑھایا گیا ہے۔ کرکٹ سے میدانِ جنگ تک، ہر معاملے میں نیچا دکھانے کی خواہش کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ بالی وُڈ کے فلم سازوں کو خصوصی ٹاسک دیا جاتا رہا ہے کہ پاکستان کو حقیقی دشمن کی شکل دے کر عوام کی نفسی ساخت میں کیل کی طرح ٹھونک دیں۔ بھارت میں تواتر سے ایسی فلمیں بنتی رہی ہیں جن کے ذریعے عوام کو یقین دلایا جاتا رہا ہے کہ جب تک پاکستان ہے تب تک بھارت حقیقی ترقی نہیں کرسکتا، مکمل خوشحالی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ بالی وڈ میں ایسی بہت سی پاکستان مخالف فلمیں بنائی گئی ہیں جو کہنے کو تو ایکشن تھرلر ہیں مگر درحقیقت کا میڈی کے زمرے میں آتی ہیں۔ اِن فلموں میں بھارتی سُورما اپنی ہر خواہش کو پورا کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض فلموں میں داؤد ابراہیم اور حافظ سعید کو اُن کے گھروں سے نکال کر سرِ عام قتل بھی کیا جاچکا ہے!

ہزار سالہ غلامی کا قلق

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مسلمانوں نے بھارت پر کم و بیش ہزار سال حکومت کی ہے۔ تختِ دہلی سے ہٹ کر بھی بھارتی سرزمین پر مسلم حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں۔ گجرات، دکن، میسور اور دیگر بہت سے علاقوں میں مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کو صدیوں مطیع رکھا ہے۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے تک کم و بیش پورے ہندوستان پر مسلمانوں ہی کی حکمرانی تھی۔ مغل سلطنت کے زوال نے مسلم اقتدار کو اختتام سے دوچار کیا۔ جب تک مسلمان اور انگریز ہندوستان کے حکمران رہے تب تک ہندوؤں میں اِتنی ہمت پیدا نہ ہوسکی کہ اُن کے خلاف کھل کر کچھ کہہ سکیں۔ جب انگریزوں سے نجات ملی تو انتہا پسند ہندوؤں کو موقع ملا کہ مسلمانوں کے خلاف فضا تیار کریں۔ سات عشروں کے دوران ہزار سالہ غلامی کا شدید احساس اور قلق انتہا پسند ہندوؤں نے عام بھارتی ہندو کی نفسی ساخت میں گاڑ دیا ہے۔ عام ہندو کو یقین دلایا جاتا رہا ہے کہ آج بھارت جن مسائل سے دوچار ہے اُن کی جڑ میں مسلمانوں کا ہزار سالہ عہدِ حکمرانی ہے۔ ہندو اہلِ علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں نے بھارت میں طرزِ حکمرانی کا معیار بلند کر کے عام آدمی کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی غرض سے وہ سب کچھ کیا جو کیا جانا چاہیے تھا۔ اِس کے باوجود مسلمانوں کو غاصب قرار دے کر عام ہندو کو اِس قدر بہکایا اور اُکسایا گیا ہے کہ آج بھارت میں مسلمانوں کو انتہائی شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

انتہا پسندوں کی ''مجبوری''

اِس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت میں ایسے ہندوؤں کی بھی کمی نہیں جو مسلمانوں سے بَیر نہیں رکھتے اور مل کر چلنے پر یقین رکھتے ہیں مگر انتہا پسند ہندو ٹولا وقفے وقفے سے ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے جن کے تحت عام ہندو بہک جاتا ہے اور بھارت میں بسے ہوئے ہر مسلمانوں کو اپنا دشمن گرداننے لگتا ہے۔ بھارت میں جب بھی فضا بہتر ہونے لگتی ہے، لوگ ایک دوسرے پر بھروسا کرنے لگتے ہیں، مذہبی ہم آہنگی پروان چڑھنے لگتی ہے تب انتہا پسند ہندو کچھ نہ کچھ ایسا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرتی فضا پھر انتہائی آلودہ ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف مخاصمت اور عداوت کا ماحول پیدا کرنا انتہا پسند ہندوؤں کی ''مجبوری'' ہے کیونکہ یہ اُن کی بقا کا مسئلہ ہے۔

علاقائی بالادستی کا خواب

آبادی کی بنیاد پر بڑی معاشی اور عسکری قوت بننے کا خواب بھارت ہمیشہ دیکھتا آیا ہے۔ یہ خواب اِس لیے دیکھا گیا ہے کہ جنوبی ایشیا میں بیشتر ممالک بھارت سے بہت چھوٹے اور معاشی و عسکری اعتبار سے کمزور ہیں۔ بھارت نے مشرقی پاکستان کو بنگلا دیش میں تبدیل کرنے کے بعد عشروں تک اُسے بغل بچہ بنا کر رکھا مگر اب بنگلا دیش بھی آنکھیں دکھانے لگا ہے۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بھارت نے بنگلا دیش کو دبوچ کر رکھنے کی حد کر دی تھی۔ پورا ملک ہی غیر موثر ہو کر رہ گیا تھا اور شیخ حسینہ واجد کا پندرہ سالہ اقتدار عملی سطح پر بھارتی کی باضابطہ غلامی کا زمانہ قرار پایا ہے۔

پڑوسیوں میں صرف پاکستان ہے جو بھارت کو منہ دینے کا محض سوچتا نہیں رہا بلکہ اُس نے عملی سطح پر ایسا بہت کچھ کیا ہے جو بھارتی قیادت کی نیند اڑانے کے لیے انتہائی کافی ثابت ہوا ہے۔ پاکستان نے بھارت سے دبنے کی پالیسی کبھی نہیں اپنائی۔ دوستی بھی کی تو اپنے اصولوں اور ضرورتوں کی بنیاد پر۔

چین بھی تو ہے!

چین بھی بھارت کا پڑوسی ہے مگر عملی سطح پر پاکستان زیادہ پڑوسی ہے۔ چین نے بھارت کو کبھی اپنے سامنے کچھ نہیں گردانا اور اِس کا جواز بھی ہے۔ جواز یہ ہے کہ چین خود بہت بڑی عالمی قوت ہے۔ اُس کی معیشت غیر معمولی ہے یعنی وہ دنیا بھر کے لیے مینوفیکچرنگ کے بہت بڑے مرکز کا درجہ رکھتا ہے۔ چین کے بارے میں عمومی تاثر یہ رہا ہے کہ وہ تجارت کی بنیاد پر جینا چاہتا ہے اور یہ کہ اُس نے عسکری قوت بڑھانے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ یہ تاثر بھی عام ہوا کہ چین صرف کمانا چاہتا ہے، لڑنا نہیں چاہتا۔

ایک زمانے تک بھارت بھی اِس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ چین اُسے منہ دینے کے قابل نہ ہوسکے گا کیونکہ امریکا اور یورپ سے اُس کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ یہ بات بھارتی قیادت سمجھنے سے قاصر رہی کہ چین بھرپور معاشی قوت بننے کے ساتھ ساتھ عسکری قوت بننے پر بھی متوجہ رہا ہے۔ اور اب یہ بات کُھل کر سامنے آچکی ہے۔

مغرب کی حکمتِ عملی

امریکا اور یورپ مل کر بھارت کو چین کے مقابل کھڑا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ بھارت کو چین کے خلاف دیوار کے طور پر بروئے کار لانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ چین کو روکنا مغرب کا ایک بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ روس کے منظر سے ہٹنے کی صورت میں مغرب کی راہ سے ایک بڑی دیوار تو ہٹی مگر چین پھر بھی سامنے کھڑا تھا۔ چین کو کمزور کرنے کے لیے کسی اور کو مضبوط کرنا لازم تھا۔ اِس کام کے لیے بھارت کو منتخب کیا گیا کیونکہ اُس سے کوئی مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی مناقشہ نہیں اور تناقص بھی کوئی نہیں۔ بھارت ثقافتی اعتبار سے مغربی دنیا سے کسی بھی قسم کی مخاصمت کا قائل بھی نہیں اور عادی بھی نہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ بھارت مینوفیکچرنگ سیکٹر میں چین کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں۔ بھارت میں آج بھی مینوفیکچرنگ سیکٹر جدید ترین ٹیکنالوجی کو بروئے کار لانے سے بہت دور ہے۔ خودکاری زیادہ نہیں اور پھر افرادی قوت کا مسئلہ بھی ہے۔ بھارت میں ایسی مینوفیکچرنگ لازم ہے جس میں انسانوں کو کھپایا جاسکے۔ اگر خودکاری اپنا کر لوگوں کو فارغ کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی تو پورا معاشرہ تلپٹ ہوکر رہ جائے گا۔

یہ تو ہوا معاشی معاملہ۔ اسٹریٹجک معاملات کا حال بھی بھارت کے حق میں نہیں۔ اب یہ حقیقت بھی کُھل کر سامنے آچکی ہے کہ چین غیر معمولی نوعیت کی دفاعی ٹیکنالوجی کا حامل ہے اور یہ کہ اگر کسی نے اُس سے اُلجھنے کی کوشش کی تو سبق سیکھنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ چین کے ساتھ بھارت کے سرحدی تنازعات رہے ہیں۔ سرحدی تنازع پر دونوں ملک ۱۹۶۲ء میں جنگ لڑ چکے ہیں۔ اِس جنگ میں چین کا پلڑا اِس قدر بھاری رہا کہ دنیا نے اُسے فاتح قرار دیا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان حالیہ چار روزہ جنگ ثابت کرچکی ہے کہ چین کو عسکری اعتبار سے ہلکا نہیں لیا جاسکتا۔ لازم ہے کہ چینیوں کو سنجیدگی سے لیا جائے تاکہ خطے میں حقیقی امن کی راہ ہموار ہو۔ امریکا اور یورپ کو بھی پیغام مل چکا ہے کہ چین کو کمزور سمجھنے کی غلطی نہ کی جائے۔ جدید ترین دفاعی ٹیکنالوجی کے میدان میں چین نے خود کو منواتے ہوئے پیغام دے دیا ہے۔ فی زمانہ جنگیں فضا ہی میں لڑی جارہی ہیں۔ فضائیہ کی مضبوطی کو پوری فوج کی مضبوطی گردانا جاتا ہے۔

چینی مہارت کا ''شوروم''

بھارتی میڈیا نے پاکستان کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا ہے، اُس میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ پاکستان نے دوسروں کے بھروسے بھارتی فوج کو للکارا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے لیے اپنا کچھ زیادہ نہیں، دوسروں کے مال پر بھروسا کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ تاثر بھی دیا گیا ہے کہ پاکستان نے چین کی عسکری قوت کے لیے شوروم کا کردار ادا کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کوئی بھی جنگ دوسروں کے دیے ہوئے ہتھیاروں اور تکنیکی مہارت کی مدد سے جیتی جاسکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ ہتھیار اپنے ہوں یا پرائے، حوصلہ تو اپنا ہی ہوتا ہے اور اپنا ہی ہونا چاہیے۔ جدید ترین ہتھیار کہیں سے لیے گئے ہوں یا کسی بھی سطح کے اشتراکِ عمل سے تیار کیے گئے ہوں، حکمتِ عملی تو اپنی ہی ہوتی ہے۔ کسی کو کھیلنے کے سو طریقے سکھایئے، جب وہ میدان میں اترتا ہے تو اپنے ہی طریقے سے، اپنے ہی اعتماد کی بنیاد پر کھیلتا ہے۔ بھارتی قیادت اِس حقیقت کے ادراک میں بہت حد تک ناکام رہی ہے۔

دوسروں کی ٹیکنالوجی پر انحصار تو بھارت کا ابتدا ہی سے وتیرہ رہا ہے۔ پہلے پہل سرد جنگ کے دوران سوویت یونین سے بھرپور تکنیکی مہارت حاصل کی جاتی رہی۔

امریکا کو بیچ میں کُودنا پڑا

پاکستان سے حالیہ چار روزہ جنگ میں بھی یہ حقیقت کُھل کر سامنے آئی کہ جنگ میں ہتھیاروں سے کہیں زیادہ اہمیت تکنیک، مہارت اور حوصلے کی ہوتی ہے۔ بھارتی قیادت کو یقین تھا کہ اُس کی فضائیہ پلک جھپکتے میں میدان مار لے گی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا ہوا کہ یہ خواب سہانا ٹوٹ گیا۔

امریکا سمجھ رہا تھا کہ پاکستان زیادہ دیر میدان میں ٹِکا نہیں رہ سکے گا اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجائے گا۔ ابتدا میں تماشا دیکھنے کو ترجیح دی گئی۔ پہل گام واقعہ کے بعد پاکستان نے بھارتی الزام تراشی کے جواب میں مشترکہ تحقیقات کی پیشکش بھی کی۔ اِس حوالے سے ثالثی قبول کرنے پر بھی رضامندی ظاہر کی گئی مگر بھارتی قیادت کسی اور ہی فضا میں اُڑ رہی تھی۔ ابھینندن والے معاملے کا بدلہ لینا مقصود تھا۔ اِس معاملے میں بھارتی قیادت حد سے زیادہ عجلت پسندی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ پاکستان نے امریکی قیادت سے بھی کہا کہ وہ بھارت کو اِس معاملے میں اعتدال کی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کرے مگر ٹرمپ انتظامیہ نے بیچ میں پڑنے سے معذرت کرلی کیونکہ اُسے یقین تھا کہ مغرب کی جدید ترین دفاعی ٹیکنالوجی کے ذریعے بھارتی فوج اپنی پاکستانی حریف کو آسانی سے زیر کرلے گی۔

جنگ شروع ہوئی تو دنیا نے کچھ اور ہی دیکھا۔ پاکستان نے چند ہی گھنٹوں میں بھارتی سُورماؤں کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ پانسا بہت تیزی سے پاکستان کے حق میں پلٹتا دیکھ کر امریکا کو ہوش آیا اور اپنے دیرینہ حلیف کو مزید پٹائی سے بچانے کے لیے وہ سامنے آیا اور جنگ رُکوائی۔ جب پاکستان نے بھارتی ایئر فیلڈز کو تباہ کرنا شروع کیا تب امریکی قیادت نے مودی سے رابطہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ بھارتی وزیرِ اعظم سے کہا گیا کہ مزید ہزیمت سے بچنے کے لیے جنگ بندی پر راضی ہو۔ اِس کے بعد پاکستان کے آرمی چیف سے بات کی گئی۔ امریکی وزیرِ خارجہ مارکو روبیو نے جنرل عاصم منیر سے گفت و شنید کے بعد بھارتی ہم منصب ایس جے شنکر سے رابطہ کیا اور کہا کہ اب جنگ بندی کا اعلان کردیا جائے۔ بھارتی قیادت تو تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے چند ہی لمحات میں جنگ بندی پر رضامندی ظاہر کردی۔ جنگ بندی فریقین کے درمیان رابطوں کے نتیجے میں واقع ہوا کرتی ہے۔ یہ انوکھا موقع ہے کہ امریکا نے کہا اور بھارت نے جنگ بندی قبول کرلی! اِسے محتاط ترین لفظوں میں بھی اعترافِ شکست ہی کہا جائے گا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جنگ بندی پہلے ہوئی اور ڈی جی ملٹری آپریشنز کی سطح پر مذاکرات بعد میں رکھے گئے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھارتی قیادت کو مزید نقصان سے بچنے کے لیے جنگ بندی کی کتنی جلدی تھی۔ یہ جلدی اُس جلدی سے زیادہ تھی جو جنگ شروع کرنے کے لیے تھی!

چین سے بھی تو کچھ پوچھیے !

امریکا نے تیزی سے آگے بڑھ کر چار روزہ پاک بھارت جنگ رُکوادی۔ ویسے چین کی خواہش رہی ہوگی کہ یہ جنگ تین چار دن اور جاری رہتی۔ ایسی صورت میں پاکستان کے ہاتھوں اُس کی عسکری ٹیکنالوجی اور مہارت کی برتری مزید مستحکم ہو جاتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس جنگ میں چین نے پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا ہے اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ مغربی طاقتیں بھی تو بھارت کی پشت پر رہی ہیں۔ چین بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مغرب کو اُس کی عسکری مہارت دیکھنی ہے۔ دفاعی ٹیکنالوجی کے شعبے میں چین نے تین چار عشروں کے دوران جو پیش رفت یقینی بنائی ہے، اُس کی ایک اچھی جھلک مغربی دنیا نے چار روزہ پاک بھارت جنگ میں دیکھ ہی لی اور بھارت نے جس تیزی سے جنگ بندی کو قبول کیا ہے، اُس سے دنیا کو بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ بھارتی فوج کتنے پانی میں ہے اور جنگ سے کس قدر بھاگنا چاہتی ہے۔

ایشیائی صدی کی آمد

امریکا اور یورپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ رواں صدی چین اور دیگر ایشیائی قوتوں کے عروج کی بدولت ایشیا کی صدی ہے۔ امریکا کی صدی ختم ہوچکی۔ پھر بھی امریکا و یورپ مل کر ایسا ماحول پیدا کر رہے ہیں جس میں چین، روس، ترکیہ اور دیگر مضبوط ایشیائی ممالک کے لیے قائدانہ کردار ادا کرنے کی طرف بڑھنا ممکن نہ ہو۔ یہ پیش قدمی اور پیش رفت روکی نہیں جاسکتی۔ مسئلہ صرف چین کا نہیں، روس کا بھی ہے۔ وہ بھی تو اب کُھل کر میدان میں ہے۔ روس اقتصادی طور پر کمزور ہوسکتا ہے، عسکری طور پر نہیں۔

رواں صدی کو ایشیا سے منسوب کیے جانے سے روکنے کے لیے امریکا اور یورپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ اس سلسلے میں بھارت سمیت کئی ممالک کو استعمال بھی کیا گیا ہے۔ چین کے خلاف بھارت کو ڈھال بنایا گیا ہے۔ بھارت کو اس بات پر ناز رہا ہے کہ امریکا اور یورپ اُس کی مٹھی، بلکہ جیب میں ہیں۔ بھارت کی تجارت اِن دونوں خطوں کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ بڑی منڈی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ امریکا اور یورپ سے اپنی عسکری قوت میں اضافہ ممکن بنانے کے لیے بھی کوشاں رہا ہے۔ کبھی وہ روس کے طیاروں، ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی پر انحصار پذیر رہا کرتا تھا۔ اب یہ بات سب پر عیاں ہے کہ روس کے پاس واضح برتری یقینی بنانے والی دفاعی یا عسکری ٹیکنالوجی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ روس کی وار مشین بالکل گئی گزری ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو زیادہ کارگر ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یوکرین جنگ نے بھی روس کو الجھا دیا ہے۔

بھارت کو مضبوط بنائے رکھنا امریکا اور یورپ کی بھی مجبوری ہے۔ ایک طرف تو بھارت بہت بڑا تجارتی پارٹنر اور معیاری افرادی قوت کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہے اور دوسری طرف وہ چین کی راہ روکنے کا ذریعہ بھی ہے۔

شکست قبول نہ کرنے کی ذہنیت

علاقائی سطح پر بہت بڑی یا سب سے بڑے طاقت ہونے کا زعم اس قدر ہے کہ اب بھارت سے شکست برداشت نہیں ہوتی۔ پھر چاہے وہ شکست کھیلوں کے میدان میں ہو یا جنگ کے میدان میں۔ ڈھائی تین عشروں سے کیفیت یہ ہے کہ بھارت کہیں بھی ہارنے کو تیار نہیں۔ اگر فتح مل نہ رہی ہو تو وہ خریدنے یا ''بڑوں'' کے ذریعے یقینی بنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

بعض کھیل ایسے ہیں جو جنوبی ایشیا میں مقبول نہیں۔ اُن کے مقابلوں میں بھارت ہار جائے تو کوئی بات نہیں۔ کرکٹ بہت بڑا معاملہ ہے۔ بھارت میں کرکٹ اور کرکٹرز کو دیوتا کا سا درجہ حاصل ہے۔ بھارتی قیادت یہ برداشت کر ہی نہیں سکتی کہ کرکٹ کے مقابلوں میں پاکستان کے ہاتھوں بھارتی کرکٹ ٹیم کو شکست کا سامنا ہو۔ جب بھی دونوں ٹیمیں آمنے سامنے ہوتی ہیں تو معرکے کو بھارت میں زندگی اور موت کا معاملہ بنا دیا جاتا ہے۔ کرکٹ کا جنون پاکستان میں بھی غیر معمولی ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ اِسے زندگی اور موت کا معاملہ بنا دیا جائے۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم کی بھارت کے ہاتھوں شکست کو بھی لوگ دو چار دن میں بھول بھال جاتے ہیں۔ بھارت میں معاملہ بہت مختلف ہے۔ بھارتی کرکٹ ٹیم کی پاکستان کے ہاتھوں شکست کی صورت میں لوگ ہفتوں صدمے سے دوچار رہتے ہیں گویا کسی نے آکسیجن سپلائی روک لی ہو۔

جب کھیل کے میدان میں بھارت کی شکست قبول و گوارا نہیں تو پھر میدانِ جنگ میں ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ جب بھی بھارت میدانِ جنگ میں ہارنے لگتا ہے تب مغربی دنیا آگے بڑھ کر اُسے بچالیتی ہے۔ ابھینندن کے معاملے میں بھی ایسا ہوا تھا۔ ابھینندن کو مغربی دنیا ہی کے دباؤ پر تین چار دن بعد واپس کرنا پڑا تھا۔ بالاکوٹ حملے جواب میں پاکستانی کارروائی کے نتیجے میں بھارت کے دو طیارے مار گرائے گئے تھے۔ بھارتی قیادت اور فوج کو اِس کا گہرا قلق تھا۔ بھارتی قیادت کو انتقام لینے کی پڑی تھی۔ موقع تلاش کیا جارہا تھا، جواز تیار کیا جارہا تھا۔ پہل گام میں سیاحوں کے قتلِ عام کو جواز بنا کر بھارت چڑھ دوڑا مگر یہ نہ دیکھا کہ پوری تیاری ہے بھی یا نہیں۔ اور اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

ایک جنگ، کئی فاتح

ایک زمانے سے ایشیائی بلاک کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دنیا کو کم و بیش ایک صدی سے امریکا اور یورپ نے مل کر دبوچ رکھا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک تو مغرب ہی کا تیار کردہ عالمی نظام کام کرتا رہا ہے۔ یہ نظام اب بوسیدہ اور فرسودہ ہوچکا ہے۔ عالمی اداروں پر مغرب نے قبضہ کر رکھا ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں یعنی مغرب کی مرضی کے مطابق۔ امریکا اب بھی عالمی سطح پر چودھری کا کردار ادا کرنے پر تُلا ہوا ہے جبکہ اُس کی حقیقی قوت میں متعدبہ کمی واقع ہوچکی ہے۔ بہت سے معاملات میں امریکا طاقت سے کہیں زیادہ محض بڑھک اور دھمکی سے کام لے رہا ہے۔ ایسا کرنا اُس کی مجبوری ہے کیونکہ اگر وہ دبنے کے لیے تیار ہوا تو مخالفین اُسے دبوچنے اور انتقام لینے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ امریکا نے یورپ کو یہ راگ پاٹھ دیا تھا کہ باقی دنیا سے تعلق رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم مل کر ہی جی لیں گے۔ یورپی قائدین جانتے ہیں کہ امریکا اور یورپ کے درمیان بھی سمندر حائل ہے۔ یورپ کی ریاستیں افریقا اور روس سے سَٹی ہوئی ہیں۔ اُن کی تقدیر کچھ اور ہے۔ لازم نہیں کہ وہ ہر معاملے میں امریکا کی طرف دیکھیں، اُسی پر منحصر رہیں۔

چین، روس، ترکیہ اور دیگر ایشیائی طاقتیں مل کر اب مغرب کو منہ دے رہی ہیں۔ یہ گویا اِس امر کا اعلان ہے کہ اگر دنیا کا امن برقرار رکھنا ہے تو مغرب کو ایشیا کے ساتھ مل کر چلنا ہوگا اور بعض معاملات میں مغرب کو دبنا بھی پڑے گا۔ اگر بات ہٹ دھرمی اور بدمعاشی کی ہے تو پھر یاد رکھا جائے گا کہ ایسی صورت میں بگاڑ دونوں طرف ہوگا اور بہت زیادہ ہوگا۔

امریکا نے پاک بھارت جنگ میں کودنے کے حوالے سے جو تیزی دکھائی، وہ لازم تھی کیونکہ دفاعی تیاریوں کے حوالے مغرب کی پیدا کردہ فضا خاک میں مل رہی تھی۔ یہ چار روزہ جنگ امریکا اور یورپ کی دفاعی ٹیکنالوجی کا بھرم بھی کھول رہی تھیں۔ یہ تاثر پیدا کیا گیا تھا کہ دفاعی ٹیکنالوجی میں فرانس اور دیگر یورپی طاقتوں کی مہارت کا توڑ دنیا بھر میں کسی کے پاس نہیں۔ چین نے یہ تاثر خاک میں ملا دیا ہے۔ امریکا جانتا تھا کہ پاکستان اگر بھارت سے ٹکرانے کے لیے تیار ہوا تو یہ محض جذبہ نہیں بلکہ مہارت کا بھی نتیجہ تھا اور جدید ترین

ٹیکنالوجی سے بہرہ مند ہونے کا بھی۔

امریکا (اور یورپ) کو اِس جنگ میں لازمی طور پر کودنا تھا۔ جب پاکستان نے مارنا شروع کیا تو یہ دیکھنے پر توجہ دی گئی کہ بھارت کب تک جھیل پاتا ہے۔ ایک ہی دن میں، بلکہ ایک ہی رات میں فیصلہ ہوگیا کہ بھارت کی عسکری قوت صفر پر کھڑی ہے۔ بھارت کو مزید مار کھانے کے لیے تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ ایسی صورت میں ایک بہت بڑا حلیف ہاتھ سے نکل جاتا۔ بھارت کی بھرپور شکست امریکا اور یورپ کے لیے بھی ہزیمت کا باعث بنتی کیونکہ اُس کی پشت پر یہی دونوں تو رہے ہیں۔ سوال ایک کمپنی کی مشہوری کا نہیں بلکہ دوسری کمپنی کی بدنامی کا بھی تو تھا۔

چین نے کیا ثابت کردیا؟

ایک زمانے سے یہ تاثر پروان چڑھایا جاتا رہا ہے چین کو صرف کمانے سے غرض ہے، لڑنے سے نہیں۔ اُسے اول و آخر تاجر یا بنیے کے روپ میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ امریکا نے دو عشروں کے دوران چین کو درخورِ اعتنا سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ایک عام آدمی جب یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ چین کی بڑھتی ہوئی قوت کو مغرب آسانی سے قبول نہیں کرے گا تو کیا چینی قیادت کو اس حقیقت کا علم و ادراک نہیں تھا؟ یقیناً تھا اور یہی سبب ہے کہ چین خاموشی سے خود کو عسکری طور پر مستحکم کرتا جارہا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ مغرب کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ چین عسکری قوت میں اضافہ کر رہا ہے مگر اُسے درست طور پر اندازہ نہ تھا کہ اِس قدر بے داغ ٹیکنالوجی کے ساتھ میدان میں آئے گا اور مغربی دفاعی ٹیکنالوجی پر اپنی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

دی ٹیلی گراف کا تجزیہ

برطانوی اخبار 'دی ٹیلی گراف' کے لیے میمفس بارکر کا شاندار تجزیہ ملاحظہ فرمائیے۔ ''چین کے سفیر کو راولپنڈی سے ایک ہنگامی کال کی گئی اور چند گھنٹوں میں ایک ایسا منصوبہ فعال ہوگیا جو طویل مدت سے تیار پڑا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ محض ایک فضائی جھڑپ نہیں تھی بلکہ بھارت کی فضائی برتری کے تاثر کا مکمل خاتمہ تھا۔ بھارتی فضائیہ نے مغربی محاذ پر تقریباً ۱۸۰ طیارے اکٹھے کیے تھے، ارادہ کیا تھا؟ بالاکوٹ کی طرز پر حملہ کرکے پاکستان کا دفاعی نظام توڑنا اور اپنی مکمل برتری ثابت کرنا لیکن فضائیں اب پہلے جیسی نہیں رہیں۔

بھارت ۳۰۰ کلومیٹر دور کیوں چلا گیا؟ بھارتی طیارے دوبارہ سرحد پار نہ کرسکے۔ بھارتی فضائیہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سرحد کے اُس پار موت منتظر ہے۔

چین کے J-10C طیارے تیار تھے۔ PL-15 میزائل بھی مکمل تیاری کی حالت میں تھے جن کی رفتار Mach-5 ہے اور ۳۰۰ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے تک مار کرسکتے ہیں۔ چین کی مدد سے پاکستان نے فضائی نگرانی کا بھرپور نظام بھی اپنایا اور تمام طیاروں کو ایک نظام کا حصہ بنایا۔ پاکستانی پائلٹس کی مہارت اور جذبہ اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ چین کا مکمل فضائی جنگی نظام تھا جو بھارت سے چار روزہ جنگ کے دوران پاکستانی فضاؤں میں متحرک اور رُوبہ کار تھا۔

فرانسیسی ساخت کے رافیل لڑاکا طیارے کا مار گرایا جانا بھارتی فضائیہ کا مورال گرانے کے لیے کافی تھا۔ ۲۵ کروڑ ڈالر مالیت کا یہ جدید ترین طیارہ بھارتی فضائیہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی سمجھا جارہا تھا۔ بھارتی سُورما یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ محض رافیل طیاروں ہی کی مدد سے سب کچھ حاصل کرلیں گے۔ رافیل طیارے کا اسپیکٹرا الیکٹرانک وارفیئر سسٹم ناکامی سے دوچار ہوا۔ کسی فعال راڈار کی معاونت کے بغیر بھی پی ایل ففٹین میزائل ہدف پر لگا۔ یہ سب کچھ مصنوعی ذہانت کی مدد سے ممکن ہوسکا۔ اِسے لڑائی نہ سمجھا جائے، یہ تو گھات لگانے کا عمل تھا۔

پاک فضائیہ نے چینی مصنوعی سیاروں اور اپنے اواکس کی مدد سے سینسر فیوژن استعمال کرتے ہوئے رافیل کو نشانہ بنایا۔ بھارتی طیارے کو ہدف کا علم ہوسکا نہ میزائل کا۔

بھارتی تذلیل اور دباؤ

رافیل، جسے بھارت نے برتری کی علامت کے طور پر خریدا، چین کے تیار کردہ میزائل سے مارا گیا۔ یہ صرف تکنیکی ناکامی نہیں بلکہ جغرافیائی پیغام بھی تھا۔ یہ واقعہ مغرب کے دفاعی حلقوں میں ہلچل مچا گیا۔ فرانس کے دفاعی سَودوں پر سوال اٹھنے لگے۔ چین خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ یہ ۲۰۱۹ء نہیں ہے، یہ بالاکوٹ نہیں ہے۔ اب بھارت کو اندازہ ہوگیا ہے کہ پاکستانی فضاؤں میں داخلہ خودکشی ہے۔

رافیل کیوں ناکام ہوا؟

ایری آئی سب کچھ دیکھتا ہے، بھارتی ریڈار کچھ نہیں۔ خاموشی سے گشت کرتے J-10C طیارے، PL-15E میزائل، کچھ بھی بھارت کو دکھائی نہیں دیا۔ لاک کے آن ہونے پر اِن میزائل کو فائر کیا گیا۔ رافیل کو جب احساس ہوا تب میزائل صرف ۵۰ کلومیٹر دور تھا۔ رفتار پانچ میک تھی۔ صرف ۹ سیکنڈ بچے تھے۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ بھارت چھپا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک سے زائد رافیل مار گرائے گئے۔ اِس کے نتیجے میں بھارتی فضائیہ اپنی ہی سرحد سے ۳۰۰ کلومیٹر پیچھے جا بیٹھی۔

چار روزہ جنگ میں بھارت کی جنگی ڈاکٹرائن کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بھارت نے صرف پلیٹ فارم خریدے تھے جبکہ پاک فضائیہ نے پوری اور مستعد کلنگ چین بنائی۔ اسپیکٹرا ای ڈبلیو غیر موثر نکلی۔ فرانسیسی ایئر ڈیفنس انجینئرنگ کارگر ثابت نہ ہوئی۔ بھارتی پائلٹ ناکام رہے۔ اُن کے خلاف ایسی مشینیں لڑ رہی تھیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔

نتیجہ: خاموش فضائی غلبہ۔ یہ صرف فضائی معرکہ آرائی نہیں تھی، ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ 'کمانڈ، کنٹرول، کمیونی کیشن، کمپیوٹرز، انٹیلی جنس، سرویلنس اور ریکی نے مل کر یہ جنگ جیتی۔'

بڑی سوچ بڑا بناتی ہے

دنیا کو اس جنگ سے بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کا جبکہ بھارت کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ بھارت رقبے اور آبادی میں بہت بڑا ہے، معاشی قوت کے لحاظ سے بھی بہت بڑا ہے کیونکہ بڑی منڈی ہے مگر معاملہ یہ ہے کہ اُس کی قیادت میں سوچ کا بڑا پن نہیں۔ اگر کسی ملک کو بڑا بننا ہے تو فکر و نظر کی بلندی لازم ہے۔ ترکیہ اِس سلسلے میں ایک روشن مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ ترک قائدین کی سوچ بلند ہے، بڑی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ قومی تعمیر کے معاملے میں کسی بھی حوالے سے کوئی سَودے بازی نہیں کرتے اور آج بھی ترکیہ اُسی شان سے جی رہا ہے جس شان سے وہ درجنوں ممالک پر حکومت کیا کرتا تھا۔

بھارتی قیادت کے لیے پیغام

بھارتی قیادت اور پالیسی سازوں کو اب یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انتقام کی سیاست کبھی ملک کو پنپنے نہیں دیتی۔ انتہا پسند ہندو ٹولے کی حکمرانی نے بھارت کو عجیب دوراہے پر کھڑا کردیا ہے۔ ابھینندن کا بدلہ لینے کے نام پر بھارت کی انتہا پسند ہندو قیادت نے مسلح افواج کو ایک ایسی جنگ سے دوچار کیا جس میں اُس کی فتح کا کوئی چانس تھا ہی نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس جنگ نے بھارتی فوج کا مورال اِس قدر گرا دیا ہے کہ اب وہ مودی اور اُن کے ساتھیوں پر مشتمل انتہا پسند ٹولے کو شاید ہی برداشت کرسکے۔ بھارتی اسٹیبلشمنٹ کو بھی سوچنا چاہیے کہ مخاصمت کی فضا کو برقرار رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آگے بڑھنا ہے تو ایک دوسرے کو قبول کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ اس وقت بھارت پورے خطے میں انتہائی عدم مقبولیت سے دوچار ہے۔ پاکستانیوں کے لیے تو بھارت ایک دشمن ملک ہے ہی، بنگلا دیش، سری لنکا اور نیپال کے لوگوں کے لیے بھی وہ کوئی دوست ملک نہیں۔ چار روزہ جنگ کا پیغام یہ ہے کہ چار دن کی زندگی ہے، مل جل کر خوشی خوشی رہنے کا آپشن اپنایا جائے۔

پاکستان: جوہری طاقت کا حصول آسان نہ تھا

ملیحہ لودھی

یہ اپریل ۱۹۹۴ء کی بات ہے۔ پاکستان کے آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ واشنگٹن کے سرکاری دورے پر تھے۔ ۱۹۹۰ء میں جوہری معاملے پر پاکستان امریکا کی جانب سے عسکری اور اقتصادی پابندیوں کا سامنا کر رہا تھا۔ نتیجتاً ۲۸ ایف۔۱۶ طیاروں اور بڑے پیمانے پر دیگر فوجی ساز و سامان جن کی پاکستان ادائیگی کر چکا تھا، امریکا نے ان پر پابندی لگا دی۔

اس پس منظر میں جنرل وحید کاکڑ کے دورہ واشنگٹن میں بار بار جوہری مسئلے کو اٹھایا گیا۔ ایک میٹنگ جہاں میں بھی پاکستان کی سفیر کی حیثیت سے شریک تھی، اعلیٰ امریکی عسکری اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے عہدیداروں نے پیشکش کی کہ اگر پاکستان اپنے جوہری پروگرام کو منجمد کرنے اور افزودگی کی حد کی تصدیق کے لیے معائنے کی اجازت دینے پر راضی ہو جائے تو طیاروں سمیت تمام ہتھیار پاکستان کو دے دیے جائیں گے۔

جنرل وحید کاکڑ نے تحمل سے ان کی بات سنی اور مؤدبانہ انداز میں اپنے میزبان سے کہا، 'حضرات میں دوستانہ تعلقات کی غرض سے آیا ہوں اور ہمارے مشرق میں دوستی کو جہازوں اور ٹینکس سے نہیں ناپتے۔ آپ ہمارے ایف ۱۶ اور ہمارے پیسے رکھ سکتے ہیں۔ ہم اپنی قومی سلامتی پر کوئی سمجھوتا نہیں کریں گے'۔

اس میٹنگ کو یاد کرنے کا مقصد یہی ہے کہ پاکستان نے کیسے اپنی سلامتی کے اہم مسئلے پر کسی قسم کا سمجھوتا کیے بغیر اپنا پختہ مؤقف برقرار رکھا۔ اگر پاکستان نے ایسا نہ کیا ہوتا اور عالمی دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا تو وہ ایٹمی صلاحیت حاصل نہیں کر پاتا جو آج ملک کی قومی سلامتی کی ضامن ہے۔

پاک۔ بھارت بحران، جھڑپوں اور فوجی تصادم کے واقعات کے باوجود، دونوں ہمسایہ ممالک کے ایٹمی طاقت بننے کے بعد سے ان کے درمیان باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی ہے۔

حالیہ بحران نے بھی جوہری طاقت کے عنصر کو واضح کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارت نے جوہری حملے کی نہج پر پہنچے بغیر محدود جنگ کرنے کے نظریے پر عمل کیا لیکن ہر بحران میں وہ حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پہلی ایٹمی طاقت بن چکا ہے جس نے دوسری جوہری طاقت پر میزائل اور فضائی حملے کیے۔ بھارت 'معمول بنا' لینا چاہتا تھا کہ جب وہ چاہے مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے کسی بھی دہشت گرد حملے کے جواب میں شواہد کے بغیر پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرائے اور پاکستان کی سرزمین پر فوجی کارروائی کرے۔

حالیہ بحران میں بھارت نے جدید ہائبرڈ جنگ کے تمام ہتھیاروں کا استعمال کیا جن میں بیلسٹک میزائل، ڈرون، غلط معلومات، نفسیاتی ہراسانی اور دیگر ہتھیار شامل ہیں۔ لیکن روایتی جنگ میں پاکستان کی صلاحیتوں نے بھارت کو تنازع بھڑکانے سے روکا۔ پاکستان کی جوابی کارروائی میں (جس میں ابتدائی طور پر بھارت کے جنگی طیارے گرائے گئے) بھارت کو اپنی جنگی جارحیت کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔

بھارتی حملوں کے دوسرے مرحلے جس میں پاکستان کے فضائی اڈوں کو نشانہ بنایا گیا، پاکستان نے بھرپور جوابی کارروائی کرتے ہوئے آپریشن لانچ کیا جس میں بھارت کے زیرِ قبضہ کشمیر و دیگر علاقوں میں فضائی اڈوں اور فوجی تنصیبات پر فضائی حملے کیے گئے، میزائل داغے گئے اور مسلح ڈرونز کا استعمال کیا گیا۔ جلد ہی واشنگٹن کی ثالث میں جنگ بندی ہوگئی جس کا اعلان امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کیا۔

پاکستان کے بھرپور فوجی ردعمل کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ بھارت کو حدود سے تجاوز کرنے اور محدود روایتی فوجی کارروائیوں کے ذریعے ایک بڑی جوہری جنگ شروع کرنے سے روک سکتا ہے۔ بھارت کے جارحانہ اقدامات نے صورتحال کو مزید خطرناک بنا دیا اور اسے ایک مکمل جنگ کے دہانے پر دھکیل دیا۔ تاہم بھارت کو پاکستان کی جوہری ریڈ لائنز کو عبور کرنے سے پہلے ہی روکنا پڑا۔ اب اگر اس منظرنامے میں جوہری ہتھیار نہ ہوتے تو ایک بھرپور جنگ چھڑ سکتی تھی۔

جوہری طاقت بننے کی پاکستان کی کہانی کو یاد کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ کیسے پاکستان نے اس سفر میں چیلنجز کا سامنا کیا اور ان پر قابو پایا۔ ایک ناقابلِ تسخیر مخالف کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان نے ابتدا میں بھارت اور اس کے مذموم تسلط پسند عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے مغرب کے ساتھ فوجی اتحاد بنا کر بیرونی توازن کی حکمت عملی پر عمل کیا۔

لیکن جب ۱۹۷۱ء میں پاکستان دولخت ہوا، تب اسے اندازہ ہوا کہ اپنی سلامتی کا تحفظ اسے تن تنہا کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ۱۹۷۴ء میں بھارت کا جوہری دھماکا اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس نے پاکستان کے لیے جوہری طاقت بننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں چھوڑا۔ تاہم مغربی ممالک نے بھارت کی سزا پاکستان کو دی اور امتیازی پالیسیاں اپنا کر پاکستان کو ضروری ٹیکنالوجی دینے سے انکار کیا۔

پاکستان کو ایٹمی طاقت بننے کے سفر میں متعدد رکاوٹوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسے مغرب بالخصوص امریکا کے دباؤ، پابندیوں اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ثابت قدم رہا۔ ملک کو اسٹریٹجک صلاحیت پیدا کرنے میں ۲۵ سال کی انتھک محنت لگی جبکہ اسے آپریشنل بنانے کے ترسیلاتی نظام بنانے میں بھی کافی وقت لگا۔ اگر یکے بعد دیگرے آنے والی عوامی اور فوجی حکومتوں نے لاگت کی پروا کیے بغیر اخراجات نہ کیے ہوتے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو پاتا۔ یہ حکومتیں جانتی تھیں کہ اس پروگرام پر قوم مضبوط اتفاق رائے رکھتی ہے۔

چند سال قبل شائع ہونے والی فیروز خان کی کتاب 'ایٹنگ گراس' میں اُن جغرافیائی اسٹریٹجک تبدیلیوں، اہم سیاسی اور سائنسی شخصیات اور اسٹریٹجک عقائد کے ارتقا کے درمیان دلچسپ تعامل کو بیان کیا گیا ہے جنہوں نے پاکستان کے جوہری پروگرام کے حوالے سے فیصلوں کو تشکیل دیا۔ یہ جوہری صلاحیت کے حصول کے لیے جستجو اور اسے درپیش چیلنجز کا دلچسپ امتزاج پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کا عنوان ذوالفقار علی بھٹو کے مشہورِ زمانہ خطاب سے ماخوذ ہے کہ جنہوں نے کہا تھا کہ اگر بھارت بم بنائے گا تو 'ہم گھاس کھائیں گے، بھوکے رہیں گے لیکن ہم بھی بم بنائیں گے'۔

فیروز خان بتاتے ہیں کہ کس طرح پاکستان نے سخت مشکلات کے باوجود نیوکلیئر فیول سائیکل میں مہارت حاصل کی۔ انہوں نے اس کامیابی کا سہرا چند افراد نہیں بلکہ سول۔عسکری اسٹیبلشمنٹ کے سیکڑوں لوگوں کے اجتماعی عزم کو دیا۔ تاہم یہ جوہری کامیابی سائنسدانوں اور انجینئرز کے گروپس کی وجہ سے ممکن ہوئی جن کی صلاحیتوں کو ابتدائی سالوں میں استعمال کیا گیا تاکہ بھارت کے اسٹریٹجک چیلنجز کا بھرپور جواب دیا جا سکے۔

پاکستان کے جوہری سفر کے ایک بالکل مختلف پہلو پر توجہ مرکوز کرنے والی کتاب 'The Security Imperative: Pakistan's Nuclear Deterrence and Diplomacy' ہے جسے بہترین سفارتکار ضمیر اکرم نے لکھا ہے۔ جوہری سفارت کاری نے ملک کی تزویراتی صلاحیت کو فروغ دینے کی کوششوں

باقی صفحہ نمبر ۱۵

پروفیسر خورشید احمد: روشن یادیں!

سلیم منصور خالد

۱۰/اپریل (۲۰۲۵ء) کی دوپہر فون موصول ہوا:

''آپ سے کہا تھا، 'جب وہ ناظم اعلیٰ تھے' کے پہلے تین حصے بھجوادیں، اس کا کیا کیا ہے؟''

''عرض کیا: فاؤنڈیشن آنے والے ایک صاحب کو دے دیے ہیں، ۲۰/اپریل تک ان شاءاللہ وہ پہنچادیں گے''۔

پھر دریافت فرمایا: ''اچھا، تو مئی کے شمارے کے لیے کون کون سے موضوعات پیش نظر ہیں؟''

عرض کیا: ''غزہ کی تازہ ترین صورتحال اور انڈیا میں مسلم وقف کے خلاف پارلیمنٹ کے فیصلے کی نسبت سے اور۔۔۔''

لفظ 'اور' کہا تھا کہ فون کا سگنل کٹ گیا، لیکن پھر فون بحال ہوا تو 'اور' سے آگے انہوں نے خود بات مکمل فرمائی:

''بلوچستان پر ضرور تحریر آنی چاہیے، صورتحال بڑی تکلیف دہ ہے۔ معلوم نہیں کیوں پورے ملک میں بےفکری کا مظاہرہ کیا جارہا ہے؟''

یہ آخری فون تھا، جس کے تین دن بعد ۱۳/اپریل ۲۰۲۵ء کی شام ۶ بج کر ۱۸/منٹ پر پروفیسر خورشید احمد صاحب کے بیٹے حارث احمد صاحب کا پیغام فون کی اسکرین پر نمودار ہوا: Abbu has returned back to his Creator۔۔۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

یوں انسانی وجود میں وہ چراغِ راہ بجھ گیا۔ انہوں نے شعوری طور پر ۱۹۴۹ء سے کردار، افکار اور پیکار کی دُنیا میں قدم رکھا اور پھر ہر لمحہ اور ہر قدم پڑھتے، لکھتے، معرکوں کا حصہ بنتے اور صف بندی کرتے ہوئے اپنے ربّ کے حضور پیش ہوگئے۔

پروفیسر خورشید صاحب نے یوں شعوری زندگی کے پورے ۷۶ برس، سکون کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے اس راہِ شوق پہ چلتے چلتے زندگی گزار دی۔ وہ زندگی جس میں:

☆ قسم قسم کے چیلنج تھے

☆ علم کا وقار پانے، سنبھالنے اور بانٹنے کا شوق تھا

☆ تعلقات کی نرمی سے آسودگی اور گاہے دوستوں کی تیراندازی کے زخم برداشت کرنے اور اس پر آہ تک نہ کرنے کی ادا تھی

☆ نظریاتی معرکوں میں ایک پُرعزم مجاہد کی طرح کھڑا رہنے اور جہاں دیدہ سپہ سالار کی طرح راہنمائی کرنے کا انداز تھا اور راہروانِ منزل کے لیے جم کر مقابلہ کرنے کی حوصلہ افزائی تھی

☆ تحریر کو امرت بنانے کی تکنیک، بیان کو کمال بنانے کی دعوت اور قلم کو سائبان میں ڈھالنے کا ہنر تھا

☆ ساتھیوں کی دست گیری کے لیے فکرمندی تھی اور اُن کے ذاتی دُکھوں میں آسرا دینے کی شفقت تھی

☆ رفقا کو مشورے کی سوغات دینے کے لیے چوبیس گھنٹے برادرانہ محبت کی خوشبو کے جھونکے تھے

☆ قدرے محدود پیمانے پر تنظیم، بڑے پیمانے پر وطن عزیز اور آفاقی درجے میں پورے گلوب پر بسنے والوں کے لیے فکرمندی کے لائٹ ٹاور روشن تھے۔ صاحبو، قوسِ قزح کے جتنے رنگ ہیں، ان سے دگنے رنگوں کو بے دام بانٹنے والی ہستی چلی گئی۔ ہر ایک کو جانا ہے کہ یہی قانونِ الٰہی ہے اور یہی عمل ابد تک جاری رہے گا۔

ذرا پیچھے چلیں تو یہ اپریل ۱۹۹۰ء کی بات ہے کہ میں نے محترم پروفیسر صاحب سے پوچھا: ''آپ نے سب سے پہلے مولانا مودودی کو کب دیکھا تھا؟''

فرمایا: ''یہ غالباً ۱۹۳۸ء سے پہلے کی بات ہے۔ میں اسکول کا طالب علم تھا۔ مولانا مودودی، میرے والد صاحب کی دعوت پر دہلی ہمارے گھر تشریف لائے۔ والد صاحب نے ضمیر بھائی اور مجھے اُن سے ملاتے ہوئے کہا: یہ میرے نہایت قابلِ احترام دوست اور بہت بڑے عالم ہیں، ان کو نظم سنایئے۔ میں پہلے ذرا جھجکا اور پھر بڑے جوش سے ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ نظم سنائی:

اسلام کا ہم سکّہ دُنیا پہ بٹھا دیں گے
توحید کی دُنیا میں، اِک دھوم مچا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
تکبیر کے نعروں سے، دُنیا کو ہلا دیں گے
اسلام زمانے میں، دبنے کو نہیں آیا
تاریخ میں یہ مضمون، ہم تم کو دکھا دیں گے
اسلام کے شیروں کو، مت چھیڑنا تم ورنہ
یہ مٹتے مٹاتے بھی، ظالم کو مٹا دیں گے
اسلام کی فطرت میں، قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا، جتنا کہ دبا دیں گے

مولانا مودودی نے شفقت سے پاس بلا کر دُعا دیتے ہوئے چند پیسے بطور انعام دیے۔ یہ مولانا کو پہلی مرتبہ دیکھنے کا واقعہ ہے اور پھر دسمبر ۱۹۴۷ء میں اچھرہ، لاہور میں مولانا سے ملے''۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور منظور ہونے کے بعد دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تحریک پاکستان شروع ہوئی۔ جناب خورشید احمد کے والد گرامی نذیر احمد قریشی، جو ایک طرف مولانا محمد علی جوہر کے دوست رہے تھے، دوسری طرف قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال سے محبت کا تعلق تھا، اور تیسری جانب مولانا مودودی سے برادرانہ مراسم تھے۔ اس آسودگی، علم دوستی اور ملّی وقومی دردمندی سے رچی فضا میں پروان چڑھتے نوخیز خورشید احمد نے دہلی کے رہائشی علاقے قرول باغ میں، 'بچہ مسلم لیگ' کا یونٹ قائم کیا، اور بچوں سے مل کر تحریک پاکستان کے نغمے، ترانے اور نعرے بلند کرنا شروع کیے۔

۷تا۹/اپریل ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس اینگلو عربیک کالج ہال، دہلی میں منعقد ہوا، جس میں 'قراردادِ لاہور' میں درج مطالبے 'مسلم اسٹیٹس' (Muslim States) کو 'مسلم اسٹیٹ' (State) میں تبدیل کرنے کی متفقہ قرارداد منظور کی گئی اور اسلام سے وفاداری کے حلف نامے پر قرآن کریم کی آیات پڑھ کر قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کی ساری قیادت نے دستخط کیے۔ اس اجلاس میں ۶۹ 'کل ہند مندوبین' کی خدمت پر مامور طالب علموں میں خورشید احمد بھی شامل تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ''اس دوران میں نے مسلم لیگ کی پوری قیادت کو دیکھا اور خاص طور پر قائداعظم کی شخصیت کے وقار، رُعب اور بزرگی کا گہرا تاثر آج تک دل ودماغ پر نقش ہے''۔

یہی خورشید احمد اپنے والدین کے ہمراہ ۱۹۴۷ء میں دہلی سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے اور مسلم ٹاؤن میں عارضی رہائش اختیار کی اور کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں بہار سے ہجرت کر کے آنے والے ان کے ہم جماعت اور دوست اقبال احمد (۹۹-۱۹۲۳ء) تھے، جو بعد ازاں ایک لبرل دانشور کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ مئی ۱۹۴۹ء میں خورشید صاحب کے اہل خانہ لاہور سے کراچی منتقل ہوئے۔ یہاں پر اُنہوں نے نومبر میں پہلا مضمون لکھا اور پھر زندگی کے آخری حصے تک فکر، قلم اور کاغذ کا یہ تعلق کبھی ٹوٹنے نہ دیا۔ ۱۹۴۹ء ہی میں ان کے بڑے بھائی ضمیر احمد، جو کراچی اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم تھے، ان سے ملنے والے جمعیت کے رفقا نے خورشید صاحب کو سماجی تعلقات کی دُنیا میں سمو لیا اور انہیں تحریک اسلامی کا مجسم ومتحرک کارکن، لیڈر، ترجمان اور مفکر بنا دیا۔

پروفیسر صاحب کے علم و فضل اور شخصیت کے حُسنِ کمال پر لکھنے والے بہت کچھ اور بہت مدت تک لکھیں گے۔ ذاتی حوالے سے داستان سرائی سے گریز کے باوجود ایک عرض کرتا ہوں کہ فروری ۱۹۷۰ء میں مجھے انتہائی مخالف کیمپ سے اللہ تعالیٰ نے موڑ کر اسلامی جمعیت طلبہ، وزیرآباد کے دفتر کا راستہ دکھایا۔ میٹرک کا امتحان ہونے میں ابھی ایک ماہ باقی تھا۔ جیسے تیسے امتحان دیا اور پھر مئی کا مہینہ آیا۔ گاؤں کی دوپہر میں جھلساتی لُو، شیشم تلے، رات کو کبھی لالٹین اور کبھی چاند کی روشنی میں اسلامی لٹریچر پڑھنے اور جذب کرنے کی پیاس بجھانے کی کوشش کرتا، تو یہ پیاس اور زیادہ بھڑکتی چلی جاتی۔ جون کا مہینہ آیا میں نے جمعیت سے کیا پایا؟ سے خرم مراد اور خورشید صاحب کے مضامین پڑھے تو دونوں شخصیات سے محبت کے رشتے میں بندھ گیا اور جب کڑاکے کی گرمی شروع ہوئی تو پروفیسر خورشید احمد صاحب کی گرفتاری میں گزرے روز و شب کی رُوداد تذکرہ زندان زیر مطالعہ آئی۔ جس نے شگفتہ بیانی، ادب کی تراوت اور اسلامی احیا کی مٹھاس سے یک جان کر دیا۔ اگست میں سالِ اوّل میں داخلہ لیا۔

اس سے اگلے ماہ پروفیسر صاحب کا پتا معلوم کروا کے وزیرآباد کے مضافات میں اپنے گاؤں کٹھوہر سے انہیں انگلینڈ خط لکھا، جس میں درج تھا: ''میں نے سالِ اوّل داخلے میں انگریزی ایڈوانس کا مضمون اس لیے لیا ہے کہ بڑا ہو کر مولانا مودودی کی کتابوں کا انگریزی میں اور سیّد قطب شہید کی انگریزی ترجمہ شدہ کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کروں۔ آپ سے راہنمائی اور دُعا چاہتا ہوں''۔

نومبر ۱۹۷۰ء کا مہینہ قومی انتخابی ہنگامے کے عروج کا مہینہ تھا۔ وہ خط جو انہیں چھے سات بدخط سی سطروں میں لکھ کر ارسال کیا تھا، اس کے جواب میں پروفیسر صاحب کا ایروگرام موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا: ''عزیزم، آپ کے جذبے کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی اور ذاتی طور پر بڑی تقویت محسوس ہوئی ہے، وہ تقویت جو اقبال نے اس طرح بیان کی ہے:

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مِرے رازداں اور بھی ہیں

اس کے ساتھ ساتھ ہی مطالعے، محنت اور یکسوئی کے لیے، تنظیم سے وابستگی اور تربیت کی پیاس بڑھانے کے لیے مشورے دیتے ہوئے لکھا: ''نصاب پر بھرپور توجہ دینا بحیثیت طالب علم آپ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ ایک اچھا طالب علم بن کر ہی اسلام، قوم اور ملّت کی خدمت کر سکتے ہیں۔ پھر گنجائش پیدا کر کے ترتیب اور سلیقے سے قرآن، سیرت، ادب، اقبال، تاریخ اور مولانا مودودی کی کتب کا مطالعہ کریں''۔ پھر یہ بھی لکھا کہ ''علمی کاموں میں اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے ادب کی اصناف افسانہ اور ناول پڑھنا ضروری ہے کہ ان اصناف میں داخلی اور خارجی کیفیات کا اظہار سادہ اور براہِ راست اسلوب میں ہوتا ہے''۔۔۔ دو تین بار خط پڑھا، تو اس کا متن یاد ہو گیا۔ میرے لیے بڑی حیرانی کی یہ بات تھی کہ ایک عام دیہاتی سے لڑکے کو، جو ابھی سالِ اوّل کا طالب علم ہے۔ اتنے بڑے استاد نے کس طرح دل کے قریب لا کر، اپنے دل میں بٹھا لیا ہے!

اس طرح نومبر ۱۹۷۰ء میں خورشید صاحب سے قلم کا جو رشتہ قائم ہوا، وہ ۱۹۷۹ء کے بعد روحانی ربط، ذاتی تعلق میں ڈھل گیا۔ ۱۹۷۴ء میں ملاقات بھی ہوئی اور ازاں بعد آپ کی تقریروں اور تحریروں کو مرتب یا ترجمہ کرنے کی سعادت ملی۔

دسمبر ۱۹۹۶ء میں خرم مراد صاحب کے انتقال کے بعد محترم قاضی حسین احمد نے پروفیسر صاحب کو ماہنامہ 'ترجمان القرآن' کا مدیر مقرر کیا۔ ان دنوں سڑک حادثے کے سبب جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ لوہے کے شکنجے میں جکڑا، مَیں گھر میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب نے رسالے کی ذمہ داری سنبھالتے ہی جنوری ۱۹۹۷ء کو پہلی مشاورتی میٹنگ ہمارے گھر، لاچار مریض کے 'ہوم کیئر بیڈ' کے قریب بیٹھ کر منعقد کی۔ محبت و اُلفت، بزرگی و سرپرستی کے کس کس ورق کو پلٹا جائے؟ یہ ممکن نہیں۔ حوصلہ افزائی کے لیے انہوں نے کیا کیا جملے کہے یا لکھے، کیوں کر بیان کروں؟ ناممکن!

البتہ ایک واقعہ 'ترجمان القرآن' میں شائع ہو گیا تھا۔ محترم خرم مراد کی یادداشتوں کو لمحات کے زیرعنوان مرتب کرنے کے بعد محترم میاں طفیل محمد صاحب کی یادداشتوں کو مشاہدات کی صورت میں مرتب کیا۔ اس کتاب کی تعارفی تقریب منصورہ میں منعقد ہوئی، جہاں محترم میاں طفیل محمد، محترم قاضی حسین احمد اور محترم پروفیسر صاحب نے خطاب کیا۔ پروفیسر صاحب نے میاں صاحب کی کتاب کے مندرجات کا شاندار الفاظ میں تعارف کرانے کے بعد، ذرا لطیف پیرائے میں فرمایا: ''مشاہدات کو میں اس پہلو سے بڑی اہمیت دیتا ہوں کہ محترم میاں صاحب نے اس میں ایک پورے دور کو جس سادگی سے مفصل اور مؤثر انداز میں پیش کر دیا ہے، وہ ہماری تحریکی زندگی اور تجربات کا خلاصہ ایک بڑا ہی قیمتی تحفہ ہے۔ مَیں علامہ اقبال کی طرح شکوہ تو نہیں کر سکتا، لیکن اپنی اس خواہش اور تمنا کا اظہار کرتا ہوں کہ کاش! سلیم منصور خالد دس سال پہلے پیدا ہوئے ہوتے اور مولانا مودودی سے بھی ان کی باتوں کو اسی طرح جمع کر لیا ہوتا''۔ (اگست ۲۰۰۱ء)

ماہانہ بنیادوں پر 'ترجمان القرآن' کی تدوین اور اس کے علاوہ تین خصوصی نمبروں کی ترتیب کے دوران صرف ایک موقع پر پروفیسر صاحب نے رسالہ دیکھ کر، ایک جملے میں اپنی ناراضی کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''کیا یہ مضمون دینا ضروری تھا؟'' میں نے وضاحت کی کہ تاریخ کے ایک ریکارڈ کے طور پر دے دیا ہے۔ یہ مضمون ایک ممتاز تاریخ دان اور بزرگ صحافی کا تھا، جس میں انہوں نے اپنے ہم مسلک رسالے کے مدیر کو لکھا تھا: ''مولانا (مودودی) نے جب واضح طور پر کہہ دیا کہ ''جو الفاظ مجھ سے منسوب کیے گئے (ہیں) وہ میں نے نہیں کہے''، تو پھر سمجھ میں نہ آیا کہ آپ نے اس بحث کو اس درجہ طول دینے کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی؟ گویا آج آپ کے لیے اس کے علاوہ کوئی (اور) مسئلہ ہے ہی نہیں، جس پر توجہ فرمائی جائے''۔ دراصل پروفیسر صاحب اس بات کو اچھا نہیں سمجھ رہے تھے، دو افراد کی باہمی خط کتابت کو ہم اپنی ضرورت کے لیے درج کریں۔

ہر مہینے 'ترجمان القرآن' جب بھی آپ کو لسٹر ملتا تو ۴ تاریخ کے بعد دو تین بار فون کر کے فرماتے: ''ابھی تک پرچہ نہیں ملا۔ شدت سے انتظار کر رہا ہوں''۔ اور جب پرچہ مل جاتا تو سب سے پہلے فون پر 'جزاک اللہ' کہتے۔ پھر پرچے کے مجموعی تاثر پر دو تین جملے کہتے اور اس کے بعد کم و بیش ہر مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ تک اعتراف کرتے کہ 'انہوں نے جو یہ بات لکھی ہے مجھے پہلی بار معلوم ہوئی ہے'، 'ان کی یہ دلیل بہت باکمال ہے'، 'یہ مضمون ذرا طویل ہے'، 'اس مضمون پر انہیں میری طرف سے شکریے کا فون کریں یا شکریے کا خط لکھیں'، 'انہیں کہیے کہ مزید لکھیں'، 'مضمون میں چند پہلو تشنہ رہ گئے ہیں، کہیے کہ ایک نئے مضمون میں وہ پہلو بھی زیر بحث لائیں'۔ یوں تقریباً دس پندرہ منٹ میں پورے رسالے کا جائزہ بیان کرتے۔

اس کے علاوہ مہینے میں سات آٹھ بار ایسا ہوتا کہ اپنے زیر مطالعہ اخبارات، رسائل اور کتب سے مضامین کی تصویر بنوا

کر، ان پر اپنے قلم سے کمنٹ لکھتے اور مختلف مقامات نشان زد کر کے بھیجتے۔ جن پر اس نوعیت کی ہدایت ہوتی: 'بہت اہم مضمون ہے'، 'اس کا ترجمہ کر کے ترجمان میں دیں'، 'اس کا ترجمہ و تلخیص کرلیں'، 'اسے محفوظ رکھ لیں'، 'اس کا ترجمہ تو نہ دیں مگر ذاتی طور پر توجہ سے مطالعہ کریں'، 'بہت مفید معلومات اور تجزیہ ہے، مضمون طویل ہے، اخذ کر کے مضمون مرتب کرلیں'، 'یہ مضمون امیر جماعت کو مطالعے کے لیے دیں' وغیرہ۔۔۔ وہ برطانیہ، امریکا، پاکستان، انڈیا کے اخبارات و جرائد کے علاوہ 'الجزیرہ' اور مختلف معروف تھنک ٹینکس کے مضامین مطالعے کے لیے ارسال کرتے۔ اتنی مشقت کے بعد پورا اعتبار کرتے کہ ہدایت پر عمل کرلیا ہوگا۔ اسی طرح قائداعظم، تحریک پاکستان اور اقبال کے بارے میں کتب خرید کر تحفہ عطا فرماتے۔

مختلف بزرگوں، جماعت سے باہر کے حلقے کے حضرات، دانشوروں اور صحافت کاروں کی صحت کے بارے میں دریافت کرتے۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے ایک جج صاحب کے سخت سوالات اور تبصرے ٹیلی ویژن اور اخبارات میں دیکھے تو فروری ۲۰۱۸ء میں مجھے ہدایت فرمائی: ''انہیں جا کر میرا پیغام دیں کہ قانون اور ضابطے کے مطابق انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے نتیجۂ فکر کو فیصلوں میں ضرور لکھیں، مگر عدالتی کارروائی کے دوران تلخ اور بلند آہنگ تبصروں سے گریز کریں۔ جج کی اصل قوت درست فیصلہ ہے، نہ کہ زبانی وقولی تبصرہ''۔ انہیں اعلیٰ عدلیہ کی تبصراتی روش پر شدید دُکھ تھا کہ ''اس سے عدالت کا وقار، فیصلے اور مقام و مرتبہ متاثر ہوگا۔ اس طرزِ عمل نے اعلیٰ عدلیہ کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے، جس سے لاقانونیت اور انتشار میں اضافہ ہوگا''۔

جب کبھی کسی فرد کے انتقال کی خبر ان تک پہنچا تا تو 'انا للہ وانا الیہ راجعون' کہہ کر ان کی خوبیوں کے بارے میں ایک دو جملے کہتے اور مغفرت کے دُعائیہ کلمات ادا فرماتے۔ مشرقی پاکستان سے جماعت اسلامی کے راہنماؤں کی پھانسیوں پر انہیں بڑے کرب کے ساتھ سنا۔ یکم ستمبر ۲۰۲۱ء کی شب سیّد علی گیلانی صاحب کے انتقال کی خبر دی: 'ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے گیلانی صاحب انتقال فرما گئے ہیں'۔ پروفیسر صاحب نے انا للہ وانا الیہ راجعون تین بار دُہرایا اور کہا: ''گزشتہ دو گھنٹے سے میری حالت ایسی تھی کہ جیسے جان نکل رہی ہے۔ ذہن ماؤف تھا، طبیعت میں سخت اضطراب تھا، اور دماغ چکرا رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اب معلوم ہوا کہ گیلانی صاحب سفرِ آخرت کی سمت روانہ تھے۔ بہت صدمہ ہوا، بہت بڑا نقصان ہوگیا ہے، اللہ مالک ہے''۔

مگر ان سب کیفیات سے ہٹ کر ۲۴ر اپریل ۲۰۱۶ء کو مختلف انداز سے اظہار ہوا، جب فون پہ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب کے انتقال کی خبر کا تبادلہ ہوا تو فرمانے لگے: ''دو گھنٹے پہلے انیس نے بتایا تھا۔ اُس وقت سے اکیلا بیٹھا ہوں اور قرآن میرے سامنے ہے۔ سلیم، سچّی بات ہے کہ راجا (ظفر اسحاق) کے جانے سے دل ٹوٹ گیا ہے'' اور فون بند کر دیا۔ پھر تقریباً دو گھنٹے بعد ان کا اپنا فون آیا: ''غم کی اس شدت میں قرآن کی مسلسل تلاوت نے مجھے سہارا دیا ہے۔ یاد رکھیں دُکھ اور درد کی گھڑی میں قرآن کے سوا کوئی چیز سہارا نہیں دے سکتی۔ قرآن ہی ایک مسلمان کو سنبھالتا ہے''۔

پروفیسر صاحب ہر مہینے دو مہینے بعد پاکستان اور انڈیا سے شائع ہونے والی کتابوں کی ایک فہرست لکھواتے کہ ''یہ بھجوا دیں، میں پیسے بھیج دیتا ہوں''۔ گزشتہ تین برسوں میں سب سے زیادہ کتب قرآن کی تشریح کے بارے میں منگوائیں۔ پھر سیرتِ رسولؐ پر، اس کے بعد قانون اور یادداشتوں پر مشتمل کتب کا تقاضا کیا۔ کتب ملنے پر باقاعدہ شکریے کا فون کرتے۔ ہر عید کو لازماً ظہر کے بعد فون آتا، مبارک اور دُعائیں دیتے۔ جب کبھی انہیں طبیعت کی خرابی کی خبر ملتی تو کہتے: ''بہترین علاج کرائیں، اس بارے میں تساہل سے کام نہ لیں''۔ چند مواقع پر یہ فون آیا: ''کام تو کوئی نہیں، بس خیریت معلوم کرنی تھی۔ اگر کبھی کوئی پریشانی ہو تو مجھے ضرور بتائیں، دُعا کے ساتھ دوا کر سکا تو مجھے دلی خوشی ہوگی''۔

پروفیسر صاحب کو جتنا بھی قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ جذبے کی گہری آنچ رکھنے کے باوجود، غصّے اور جذبات سے کوئی کلمہ اُن کی زبان سے نہیں چھلکتا۔ اجتماعی زندگی کے معاملات پر واضح رائے رکھنے کے باوجود وہ کبھی نظم کی حد سے آگے بڑھ کر کوئی بات نہیں کرتے بلکہ نظم اور تحریک کی پالیسی کے دفاع کے لیے بڑے توازن سے پوری قوت لگا دیتے ہیں۔ حقیقت میں وہ قائد تھے لیکن ان کے سراپے میں ایک بہترین صابر و شاکر کارکن متحرک تھا۔

مطالعے کے لیے راہنمائی دیتے ہوئے فرماتے: ''دینی لٹریچر کا آپ مطالعہ کرتے رہیں لیکن خاص طور پر اقبال کے کلام، خطوط اور نثری اثاثے کا مطالعہ کریں اور قائداعظم کی تقاریر اور خطوط کو بڑی توجہ، باریک بینی اور ترتیب سے پڑھیں۔ ان میں تاریخ اور رہنمائی بھی ہے اور ہمارے سماجی اُمور کو سمجھنے اور سلجھانے اور قانون کے راستے سے حل تلاش کرنے کا لائحہ عمل بھی''۔ ایک روز فرمایا: ''یاد رکھیں پاکستان کے بدخواہوں میں اتنی ہمت تو نہیں کہ اسلام اور پاکستان پر براہِ راست حملہ کر سکیں، مگر وہ اپنے مذموم مقصد کو پورا کرنے کے لیے اُوچھے اور گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اقبال، قائداعظم اور مولانا مودودی کو ہدف بناتے ہیں۔ اس لیے درست انداز سے حقائق کو پیش کرتے ہوئے ان کی مدافعت کے لیے ہر وقت بیدار، تازہ دم اور متحرک رہیں''۔

ایک روز فرمایا: ''جولائی ۱۹۴۸ء میں مَیں نے لاہور میں کالج کی لائبریری میں 'ڈان' سے قائداعظم کی تقریر پڑھی، جو انہوں نے اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر کی تھی۔ چونکہ میرا رجحان معاشیات پڑھنے کی طرف تھا، اس لیے میں نے یہ سمجھا کہ اس تقریر کا مخاطب میں بھی ہوں، اور ساتھ ہی اسلامی معاشیات کے بارے میں موہوم سے سوالات اُٹھنے لگے۔ سال بھر کے بعد مولانا مودودی کے ہاں معاشیات کی اسلامی تفہیم و تشریح پڑھی تو دل و دماغ مکمل یکسوئی کے ساتھ اسلامی معاشیات سے وابستہ ہوگئے''۔

یاد رہے قائداعظم نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر اپنی آخری تقریر میں فرمایا تھا: ''معاشرتی اور معاشی زندگی کے اسلامی تصورات سے بنکاری کے نظام کو ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں آپ جو کام کریں گے، میں دلچسپی سے اس کا انتظار کروں گا۔ اس وقت مغربی معاشی نظام نے تقریباً ناقابلِ حل مسائل پیدا کر دیے ہیں، اور شاید کوئی کرشمہ ہی دُنیا کو اس بربادی سے بچا سکے، جس کا اسے اس وقت سامنا ہے۔ یہ نظام افراد کے درمیان انصاف اور قوموں کے درمیان ناچاقی دُور کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ مغربی دُنیا اس وقت میکانکی اور صنعتی اہلیت کے باوصف جس بدترین ابتری کا شکار ہے، وہ اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ مغربی اقدار، نظریے اور طریقے، خوش و خرم اور مطمئن قوم کی تشکیل کی منزل کے حصول میں ہماری مدد نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنے مقدر کو سنوارنے کے لیے اپنے ہی انداز میں کام کرنا ہوگا، اور دُنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرنا ہوگا، جس کی اساس و بنیاد انسانی مساوات اور معاشرتی عدل کے سچّے اسلامی تصور پر کھڑی ہو۔ اس طرح ہم مسلمان کی حیثیت سے اپنا مقصد پورا کر سکیں گے، اور بنی نوع انسان تک امن کا پیغام پہنچا سکیں گے۔ صرف یہی راستہ انسانیت کو فلاح و بہبود اور مسرت و شادمانی

سے ہمکنار کرسکتا ہے‘‘۔

اس طرح انٹرمیڈیٹ کے طالب علم خورشید احمد نے اپنے قومی اور فکری قائدین سے، اپنے من کی دُنیا میں جو عہد کیا تھا، ساری زندگی اسی عہد کی تکمیل کے لیے تج دی۔ ۱۹۵۸ء میں اکنامکس پر پہلی کتاب Essays on Pakistan Economy لکھی اور ۱۹۶۱ء کو علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی کے نام خط لکھا: ’’کراچی یونیورسٹی میں میرا تقرر ہوگیا ہے۔ Economic Planning اور Agricultural Economics پڑھا رہا ہوں۔ ’پلاننگ‘ کا پرچہ فائنل میں اور ’ایگریکلچرل‘ پریویس میں۔ دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان نئی ذمہ داریوں کو اُٹھانے کی توفیق دے۔ پہلے بھی کام بہت تھے، اور اب تو بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ دو پرچوں (مراد ہیں اقبال اکادمی کا اُردو/انگریزی Iqbal Review اور ماہ نامہ چراغِ راہ) کی ادارت، یونیورسٹی، اجتماعی کام، ذاتی مصروفیات، ترجمہ و تالیف۔۔۔ خدا ہی ہمت دے اور ان کاموں کو بخیر و خوبی انجام دلائے‘‘۔

سفرِ شوق کی کٹھن راہوں پر چلتے ہوئے مسافر تھکا نہیں۔ ملازمت کے گوشے تک محدود رہنے کے بجائے اس طرزِ فغاں کو پورے گلشن میں عام کرنے کے لیے مسلسل کوشش جاری رکھی، جس میں نو ماہ جیل میں بھی گزارے، مگر نگاہیں منزل پر جمی رہیں۔ ۲۷/اپریل ۱۹۶۸ء کو نجات اللہ صدیقی صاحب کو خط لکھا: ’’الحمدللہ، ہماری کوششوں سے ایک بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے، وہ یہ کہ کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں نے ایم اے (اکنامکس) کی سطح پر Economics of Islam کا ایک پورا پرچہ ۱۰۰ نمبر کا متعارف کردیا ہے۔ آپ کو کراچی اور پنجاب کے سلیبس بھیج رہا ہوں، تاکہ آپ اس پر غور کرسکیں اور ہماری کچھ مدد کرسکیں‘‘۔

بعد ازاں قومی اور عالمی سطح پر معاشیاتِ اسلام اور اسلامی بنکاری کے لیے کانفرنسوں، سیمیناروں کے انعقاد اور اداروں کی تشکیل و تعمیر، اور افراد سازی کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رکھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج مغربی علمی دُنیا انہیں ’فادر آف دی اسلامک اکنامکس‘ کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

یہ ان کے لڑکپن کی بات ہے، خورشید احمد صاحب، اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا دستوری مسودہ تیار کرکے ارکان کو پیش کرنے والی سہ رکنی کمیٹی کے رکن تھے (دوسرے ارکان میں خرم مراد اور ظفر اسحاق انصاری شامل تھے)۔ خورشید صاحب نے بتایا: ’’جمعیت کے دستور کی تدوین کے وقت حلفِ رکنیت میں زندگی کے مقصد کے اظہار و اعلان کے لیے جس قرآنی آیت کا انتخاب کیا گیا، وہ خرم بھائی اور راجا بھائی (ظفر اسحاق) ہی کی تجویز کردہ تھی، اور جب انہوں نے تجویز کی تو اپنی کم علمی کے باوجود میری زبان سے بے ساختہ نکلا: ’میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ آیت مبارکہ ہے: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن (الانعام:۱۵۲)‘‘ کہو، میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے‘‘۔

پروفیسر صاحب نے اپنے دونوں مجوز ساتھیوں کی طرح اس عہد کو لکھا، پڑھا اور آخر دم تک نبھایا۔ اکتوبر ۲۰۱۶ء میں آنکھ کا آپریشن کرایا تو دائیں آنکھ ضائع ہوگئی لیکن اس تکلیف کے باوجود کمزور نظر اور محدب عدسے کی مدد سے مطالعہ کو جاری رکھا اور انتقال سے تین چار روز پہلے تک قلم سے رشتہ قائم رکھا۔۔۔ دوسری تیسری کلاس کے بچّے نے مولانا مودودی کو جو نظم تحت اللفظ میں اور ہاتھ کے پُرجوش اشاروں کے ساتھ سنائی تھی، اس نظم کو اپنی زندگی کا ساز بنالیا۔ اور پھر اس مغنی نے دُنیا کے گوشے گوشے میں اس نغمے کی گونج پھیلانے کے لیے تن من دھن لگادیا:

اسلام کا ہم سکّہ دُنیا پہ بٹھا دیں گے
توحید کی دُنیا میں اِک دھوم مچا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا، جتنا کہ دبا دیں گے

نتائج پیدا کرنا اللہ کی مشیت اور حکمت پر منحصر ہے، مگر شعوری طور پر زندگی لگا دینا فرد کی ذمہ داری ہے۔ پھر لاہور میں قائداعظم کی آخری تقریر اخبار سے پڑھ کر جو عہد اپنے خالق سے باندھا تھا، پوری زندگی اس عہد کو نبھانے کے لیے وقف کردی، جس کے روشن نقوش پوری دُنیا کی مالیاتی زندگی میں ایسے فرزانوں کا انتظار کررہے ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر علم کا علَم بلند کریں: مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاہَدُوا اللہَ عَلَیْہِ o فَمِنْہُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْہُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ o وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا o (احزاب:۲۳)‘‘ اُن میں سے کوئی اپنی نذر پوری کرچکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ اُنہوں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی‘‘۔

پروفیسر خورشید احمد تحریک اسلامی کے اس قافلے کا آخری ستون تھے، جس قافلے کے سالار اور مجاہد اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرکے اللہ کے حکم پر ابدی دُنیا کو لوٹ گئے۔ وہ قافلہ جو فکر بھی تھا، طریقۂ زندگی بھی، جس نے سماجی اور اجتماعی زندگی کو ایک قرینہ عطا کیا ہے، جس قافلے نے طوفانوں کے سامنے کھڑا ہونے اور ایمانی و علمی اور منطقی اپروچ سے شائستگی و بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنے کا انداز سکھایا ہے، جس نے عددی قوت کی

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

پروفیسر صاحب کی کشمیر سے قلبی وابستگی

ارشاد محمود

پروفیسر خورشید احمد صاحب کو دیکھنے اور سننے سے پہلے اُن کے علم، فہم، تدبر اور کردار کا بہت چرچا سن رکھا تھا۔ ان کا نام علمی، فکری اور دینی حلقوں میں احترام سے لیا جاتا تھا۔ تاہم، ۱۹۹۲ء میں جب مجھے اُن کے قائم کردہ ادارے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (آئی پی ایس) سے وابستہ ہونے کا موقع ملا، تو اُنہیں قریب سے دیکھنے، سننے اور ان سے استفادہ کرنے کے کئی مواقع میسر آئے۔

پروفیسر صاحب عشروں سے برطانیہ میں مقیم تھے، لیکن جب بھی سینیٹ کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے پاکستان آتے، تو بڑی تیاری اور جامع منصوبہ بندی کے ساتھ آتے۔ پاکستان میں ان کے قیام کے دوران انسٹیٹیوٹ میں متعدد علمی نشستیں، سیمینار اور کتابوں کی تعارفی تقاریب کا انعقاد ہوتا، جن کی ترتیب و تنظیم میں مجھے بھی شریک رہنے کا موقع ملتا۔ ان تقریبات کے انتظام و انصرام کے دوران نہ صرف ادارے کے سربراہ جناب خالد رحمٰن کی راہنمائی میسر آتی، بلکہ پروفیسر خورشید احمد صاحب سے بھی براہِ راست تبادلۂ خیال کا موقع ملتا، جس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے اور استفادے کے کئی نئے دریچے کھلتے۔

پروفیسر خورشید صاحب کی دلچسپیاں بے حد وسیع اور متنوع تھیں: ۔۔۔اسلامی معیشت، تعلیم، اسلامی تحریکیں، پاکستان کی سیاست، عالمی امور اور مسلم امہ کے مسائل۔ گویا ہر موضوع ان کے فکری کینوس پر نمایاں تھا۔ تاہم، کم لوگوں کو معلوم ہے کہ نوّے کے عشرے کے بعد سے انہوں نے اپنے قیمتی وقت کا ایک بڑا حصہ کشمیر کاز کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

ان سے میری قربت اور ملاقاتوں کی بنیاد بھی کشمیر ہی بنا۔ وہ سال میں تین سے چار مرتبہ برطانیہ سے اسلام آباد آتے تو ان کے معتمدِ خاص، راؤ محمد اختر، اُن کی مصروفیات کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اطلاع دیتے: ''میاں، ملاقات کی تیاری کر لو''۔ اس کا مطلب ہوتا کہ پروفیسر صاحب کو میں نے گزشتہ چند ماہ کے دوران کشمیر اور پاک بھارت تعلقات کے پس منظر میں رُونما ہونے والے اہم واقعات کی جامع بریفنگ دینی ہے۔ ۔۔۔ایسی بریفنگ جو نہ صرف حالات کا خلاصہ ہو بلکہ اس کے تحریکِ آزادی پر اثرات کی جامع تصویر بھی پیش کرے۔

ابتدا میں یہ بریفنگ محض سات سے دس منٹ پر مشتمل ہوتی، مگر رفتہ رفتہ اس کا دورانیہ بڑھتا گیا۔ چونکہ اُن کے پاس وقت نہایت محدود ہوتا اور مصروفیات کا ایک انبار ہوتا، اس لیے مجھے ہمیشہ 'دریا کو کوزے میں بند' کرنے کا ہنر آزمانا پڑتا۔ اس بریفنگ کے دوران وہ اکثر اہم سوالات کرتے، میری آرا لیتے اور کئی مرتبہ حکومتی اہلکاروں، سفارت کاروں یا سیاست دانوں سے ہونے والی گفتگو کے اہم نکات بھی میرے ساتھ شیئر کرتے۔ یوں کشمیر اور پاک۔ بھارت تعلقات کی پیچیدہ اور باریک بین جہتوں کو سمجھنے میں مجھے گراں قدر رہنمائی حاصل ہوتی۔

کشمیر کے ہر پہلو سے ان کی دلچسپی تھی۔ تحریکِ مزاحمت کی بدلتی صورتحال سے وہ ہمیشہ باخبر رہتے، لیکن ان کی توجہ صرف سیاسی سرگرمیوں تک محدود نہیں تھی۔ وہ کشمیر پر ہونے والے علمی کاموں کو بھی دل سے سراہتے اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے۔ نوّے کے عشرے میں ڈاکٹر طاہر امین نے Mass Resistance in Kashmir کے عنوان سے ایک اہم کتاب لکھی۔ اس کی تعارفی تقریب آئی پی ایس میں ہوئی۔ اس موقع پر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے صدر، ڈاکٹر ممتاز احمد نے انکشاف کیا کہ انہوں نے ستّر کی دہائی میں کشمیر پر جو کتاب لکھی تھی، اس کے پسِ پردہ بھی پروفیسر خورشید صاحب ہی کی تحریک اور حوصلہ افزائی کارفرما تھی۔

پروفیسر صاحب کی سرپرستی میں آئی پی ایس نے کشمیر پر درجنوں کتابیں شائع کیں اور سیکڑوں علمی سیمینار اور فکری نشستوں کا انعقاد کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسئلہ کشمیر صرف سیاسی نعروں یا سفارتی بیانات تک محدود نہ رہے بلکہ فکری اور علمی میدان میں بھی اس پر سنجیدہ بات ہو۔

یہ ان کی کشادہ ظرفی اور فکری وسعت تھی کہ آئی پی ایس کا پلیٹ فارم ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کے لیے کھلا تھا۔ شاید ہی کوئی اہم کشمیری رہنما ایسا ہو جسے یہاں بات کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ جو بھی کشمیری لیڈر پاکستان تشریف لاتا، آئی پی ایس میں اس کے ساتھ تبادلہ خیال کی ایک محفل ضرور برپا ہوتی۔ جناب عبدالغنی لون، شیخ عبدالعزیز، سردار محمد ابراہیم خان، سردار عبدالقیوم خان، یاسین ملک، امان اللہ خان اور وید بھیسین جیسے کئی بڑے نام اس فورم پر آ کر پاکستانی دانشوروں کے ساتھ مکالمے میں شریک ہوئے۔

کشمیر کے حوالے سے پروفیسر خورشید صاحب کی سوچ محض عوامی یا غیر رسمی دائرے تک محدود نہ تھی۔ وہ حکومت اور سرکاری اداروں کے ساتھ رابطے کو بھی ضروری سمجھتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ ریاستی سطح پر بھی راہ نمائی کی جائے۔ جب تک وہ سینیٹر رہے، ہر دورِ حکومت میں انہوں نے مسئلہ کشمیر پر مدلل، متوازن اور مؤثر تجاویز پیش کیں۔ سینیٹ میں ان کی تقاریر قومی، فکری اور ملّی سوچ کی بھرپور عکاس ہیں۔

پروفیسر خورشید صاحب کا فکری خمیر تحریکِ پاکستان کے ماحول میں پروان چڑھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے فرمودات اور تقاریر کے برمحل حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ ان حوالوں کو صرف تاریخی تناظر میں نہیں بلکہ موجودہ حالات کی روشنی میں نئے مفاہیم کے ساتھ پیش کرتے، اور یوں تاریخ اور حال میں ایک فکری ربط قائم کرتے تھے۔

ایک بار میں نے انڈیا کے ممتاز قانون دان اے جی نورانی (۱۶ستمبر ۱۹۳۰ء۔ ۲۹راگست ۲۰۲۴ء) کو میریٹ ہوٹل، اسلام آباد سے لے جا کر پروفیسر خورشید صاحب سے ملاقات کرائی۔ نورانی صاحب بڑے محقق اور دانشور تھے، ان کا دل کشمیریوں کے لیے دھڑکتا تھا۔ اپنی کتابوں اور مضامین میں انہوں نے کشمیر کے مختلف پہلوؤں کو مدلّل انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف (۱۹۴۳ء۔ ۲۰۲۳ء) کے دور میں وہ 'ٹریک ٹو' ڈپلومیسی میں بھی کافی سرگرم رہے۔ انہی دنوں انہوں نے جنرل مشرف کا ایک دھماکا خیز انٹرویو کیا تھا جو پندرہ روزہ "Frontline" میں شائع ہوا۔ نورانی صاحب، سیّد علی گیلانی (۲۹ستمبر ۱۹۲۹ء۔ یکم ستمبر ۲۰۲۱ء) کے بھی بہت قریب تھے، اور انہوں نے گیلانی صاحب کو مشرف کے چار نکاتی فارمولے کی حمایت پر آمادہ کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانے۔

نورانی صاحب جانتے تھے کہ سیّد علی گیلانی، خورشید صاحب کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان کی رائے کو نظرانداز نہیں کرتے۔ اس لیے انہوں نے پروفیسر خورشید صاحب سے کہا کہ آپ گیلانی صاحب کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کوئی راہ نکالی جا سکے، خاص طور پر مشرف فارمولے کے تحت''۔ مگر گیلانی صاحب کا موقف واضح اور غیر متزلزل تھا۔ دونوں بزرگوں کے درمیان خاصی طویل

ملاقات رہی، مگر بات بنی نہیں، کیونکہ پروفیسر خورشید صاحب، گیلانی صاحب پر دباؤ ڈالنے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ سیّد علی گیلانی کی شجاعت اور قربانی کے بہت بڑے مداح تھے۔

پروفیسر خورشید احمد محض ایک دانش ور ہی نہیں تھے بلکہ ایک سرگرم سیاسی اور سماجی رہنما بھی تھے۔ وہ صرف علمی میدان میں ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھرپور طریقے سے شریک رہتے تھے۔ کشمیر کے حوالے سے ان کی وابستگی محض جذباتی اور قومی بنیادوں پر نہیں تھی، بلکہ انہوں نے اخلاقی، اصولی، قانونی اور تنظیمی سطح پر بھی گراں قدر کردار ادا کیا۔ برطانیہ میں تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو منظّم کرنے میں ان کا کردار کلیدی تھا۔ اسلامک مشن کے پلیٹ فارم سے ابتدا کی، اور پھر اسی کے بطن سے 'تحریکِ کشمیر' کے نام سے ایک باقاعدہ فورم تشکیل دیا۔

برسوں تک تحریکِ کشمیر کی قیادت مردِ درویش منور حسین مشہدی مرحوم کے ہاتھ میں رہی، اور اس پلیٹ فارم نے برطانیہ میں کشمیر کاز کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ برطانیہ میں مقیم کشمیری، پاکستانی اور دیگر مسلمانوں کو منظّم کرنا، ان کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو سیاسی اور فکری میدان میں اُجاگر کرنا ان کا ہدف تھا۔

اسّی کے عشرے میں جب مسئلہ کشمیر نئے پس منظر میں انگڑائی لے رہا تھا۔ پروفیسر خورشید صاحب نے پیر حسام الدین ایڈووکیٹ، جو مقبوضہ کشمیر کے ایک مایہ ناز قانون دان اور تحریکی رہنما تھے، انہیں برطانیہ مدعو کیا جہاں وہ کافی عرصے تک مقیم رہے، اور برطانیہ اور یورپ میں مسئلہ کشمیر کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں پیر حسام الدین واپس مقبوضہ کشمیر چلے گئے کیونکہ حج کے دوران بھارتی حکام نے ان کا پاسپورٹ ضبط کرلیا تھا، جہاں ۲۰۰۴ء میں 'نامعلوم افراد' کے ہاتھوں شہید کردیے گئے۔

ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل کے حوالے سے کشمیری حلقوں میں متعدد پہلوؤں پر اختلافِ رائے پایا گیا ہے۔ اگرچہ ایک بڑی اکثریت پاکستان سے محبت کرتی ہے، لیکن ایک نمایاں طبقہ ایسا بھی ہے جو کشمیر کو ایک 'خودمختار ریاست' کے طور پر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی نیا خیال نہیں، بلکہ اس کی جڑیں بیسویں صدی میں چالیس کے عشرے تک جاتی ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں جب تحریک مزاحمت نے ایک ہمہ گیر عوامی تحریک کی شکل اختیار کی، تو اس مسئلے پر خاصی تلخیاں بھی پیدا ہوئیں۔ کشمیر کے مستقبل کے سوال پر کئی محاذ کھل گئے، اور افسوس کہ اس کشمکش میں دونوں طرف کا جانی اور سیاسی نقصان ہوا۔

مجھے پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں مقبوضہ کشمیر اور دہلی جانے کا موقع ملا۔ ان دوروں نے نہ صرف کشمیر کی زمینی حقیقت کو قریب سے دیکھنے کا موقع دیا بلکہ کئی اہم سیاسی رہنماؤں سے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہوئے۔ جناب یاسین ملک بھی ان میں سے ایک تھے۔ ان سے پہلی ملاقات رسمی تھی، لیکن جلد ہی یہ تعلق دوستی میں اور پھر گہری رفاقت میں بدل گیا۔

اسی تعلق کی بنیاد پر راقم نے یاسین ملک کی ملاقات خورشید صاحب سے کروائی، اور پھر دونوں کے درمیان بھی ذاتی سطح پر ایک احترام اور مشاورت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ پروفیسر خورشید صاحب نے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ سیّد علی گیلانی اور میر واعظ عمر فاروق کے ساتھ مل کر جدوجہد کو مربوط بنائیں۔ کشمیر کے مستقبل کے سوال پر انہوں نے یاسین ملک کو یہی مشورہ دیا کہ فیصلہ کشمیری عوام کی مرضی اور رائے پر چھوڑ دینا چاہیے۔

۲۰۱۱ء میں جب یاسین ملک اسلام آباد میں کچھ وقت گزار کر واپس سری نگر لوٹے، تو ان کی تمام تر توجہ حریت پسند جماعتوں کے درمیان اتحاد پر مرکوز رہی۔ انہوں نے جناب علی گیلانی اور میر واعظ عمر فاروق کو ایک میز پر بٹھایا، جو ایک بڑا اقدام تھا۔ لیکن بھارت کی جانب سے اس کوشش کا شدید ردعمل آیا۔ بھارتی اسٹیبلشمنٹ غیر معمولی طور پر مشتعل ہوئی، اور یاسین ملک کو اس کی بھاری قیمت چکانا پڑی، ۔۔۔ جو وہ آج تک تہاڑ جیل میں چکا رہے ہیں۔

۵/اگست ۲۰۱۹ء کو بھارتی حکومت نے مقبوضہ جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت کو دفعہ ۳۷۰ اور ۳۵۔اے سے متعلق ایک آئینی ترمیم کے ذریعے ختم کرکے ریاست جموں وکشمیر کی آبادی کے تناسب کو بگاڑنے کی راہ ہموار کردی۔ اس نازک مرحلے پر، پروفیسر خورشید صاحب نے ماہنامہ 'ترجمان القرآن' میں کشمیری قیادت کو مشورہ دیا کہ وہ تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ریاست جموں وکشمیر کے مسلم تشخص کے تحفظ کے ایک نکاتی ایجنڈے پر وسیع البنیاد اتفاق رائے پیدا کریں۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ بھارت نواز اور آزادی پسند کشمیری سیاستدانوں میں اختلافات محض سیاسی نوعیت کے نہیں ہیں، بلکہ یہ خلیج ناقابلِ عبور ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے تمام مکاتب فکر کے لوگوں کو متحد ہوکر مسلم تشخص کے تحفظ اور آبادی کا تناسب بگاڑنے کے بھارتی حربوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور عملی اقدام کی اپیل کی۔

اسی طرح، حالیہ چند ماہ کے دوران آزاد جموں وکشمیر میں گورننس کی ناکامی اور سیاسی عدمِ استحکام کے باعث شدید عوامی بے چینی نے جنم لیا، جو بالآخر ایک ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کرگئی۔ اس موقع پر بھی، پروفیسر خورشید صاحب نے 'ترجمان القرآن' (فروری ۲۰۲۵ء) کے ایک اداریے میں توجہ دلائی کہ اس تحریک کو ہرگز پاکستان مخالف رنگ نہ اختیار کرنے دیا جائے، بلکہ آزاد کشمیر کے عوام کو درپیش بنیادی مسائل کا سنجیدگی سے حل نکالا جائے۔ ساتھ ہی، کشمیری عوام کو مشورہ دیا کہ وہ قومی دھارے سے جڑے رہیں اور پاکستان مخالف جذبات کو آزاد کشمیر کی فضا میں جڑ نہ پکڑنے دیں۔ غالباً مسئلہ کشمیر پر پروفیسر خورشید احمد صاحب کی یہی آخری تحریر تھی۔۔ ایک فکرانگیز اور بصیرت افروز وصیت کی صورت میں۔

پروفیسر صاحب نہ صرف حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ اپنے نظریاتی مخالفوں اور اپنے ساتھیوں کی تحریروں کا بھی بڑی توجہ سے مطالعہ کرتے تھے۔ ۲۰۰۴ء میں جب جنرل پرویز مشرف نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے چار نکاتی فارمولا پیش کیا، تو میں نے عمومی طور پر اس خیال کی حمایت کی۔ میری نظر میں یہ ایک جمود توڑنے والا قدم تھا، جو مسئلہ کشمیر کو ایک نئی سمت دے سکتا تھا۔ میں نے اخبار 'دی نیوز' میں اس پر ایک مضمون لکھا، جس میں مشرف کی سوچ کو پیشرفت کی ایک صورت کے طور پر بیان کیا۔ مضمون چھپنے کے چند گھنٹوں بعد پروفیسر صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے: ''اگر آپ یہ لکھتے کہ یہ حل کی طرف پہلا قدم ہوسکتا ہے، تو بات زیادہ مدلل اور مؤثر ہوتی''۔ ایک بار انہوں نے روزنامہ 'جنگ' میں میرا ایک مضمون پڑھا تو بلاکر ستائش کی اور ساتھ مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''برٹرینڈ رسل کی کتابیں پڑھو، دیکھو وہ کیسے دلیل قائم کرتے ہیں، ان کی تحریریں مختصر لیکن پراثر ہوتی ہیں''۔

لگ بھگ سولہ برس پہلے میں نے آئی پی ایس سے علیحدگی اختیار کرلی اور دیگر اداروں سے وابستہ ہوگیا، مگر اس کے باوجود پروفیسر صاحب کی شفقت اور توجہ قائم رہی۔ دو برس قبل پروفیسر صاحب کے معاون 'ترجمان القرآن' نے بتایا کہ ''پروفیسر صاحب چاہتے ہیں کہ خرم پرویز، جو انسانی حقوق کے نمایاں علَم بردار ہیں اور جنہیں بھارت میں جھوٹے مقدمات میں جیل میں ڈال دیا گیا ہے، ان پر آپ کے انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ 'ترجمان القرآن' میں شائع ہو''۔ میرے لیے یہ بات باعثِ مسرت تو تھی لیکن حیرت کا باعث بھی کہ اس قدر علیل ہونے کے باوجود ان کا دل کشمیر میں اٹکا ہوا ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

ڈرنے کا زمانہ گیا!

H.M. Nazmul Alam

ایک دور تھا، جسے گزرے ابھی بہت زیادہ دن نہیں گزرے، جب بھارت اور بنگلا دیش کے درمیان واقع سرحد

مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان مرحوم) کے مسلمانوں نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ سے لڑ جھگڑ کر آزادی حاصل کرلی اور اپنے خطے کو بنگلا دیش میں تبدیل کرلیا مگر اِس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ پچھتاوے کے ایک بہت بڑے سبب کے سوا کچھ نہ تھا۔ بھارت نے مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کرنے میں کُھل کر انتہائی بے شرمی سے کی جانے والی مداخلت پر مبنی کردار ادا کیا اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اُن کا حقیقی نجات دہندہ اگر کوئی ہے تو وہ بس بھارت ہے۔

بنگلادیش کے قیام کے بعد جو کچھ ہوا، اُس نے یہ ثابت کردیا کہ جب تک یہ خطہ (مشرقی بنگال) پاکستان کا حصہ تھا، تب اِس کے باشندے مکمل محفوظ تھے اور اُن کا دین بھی محفوظ تھا۔ بھارت نے بنگلا دیش کے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے پورے علاقے کو اپنی مٹھی میں رکھنے کا عمل شروع کردیا۔ شیخ مجیب الرحمن نے بنگلا دیش کو بھارت کی آغوش میں دینے کے معاملے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی اور یوں پاکستان سے چھٹکارا پانے والے بنگالی بھائی بھارت کے جال میں پھنس گئے۔ بنگلا دیش کے قیام کو ۵۲ سال ہوچکے ہیں۔ اِس مدت کے دوران چند برس چھوڑ کر بنگلا دیش کے باشندے بھارت کے زیرِدست اور زیرِنگیں رہے ہیں۔

بھارت نے ہر معاملے میں بنگلا دیش کو دبوچنے اور دبائے رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اُس کی سلامتی اور سالمیت، دونوں ہی کو خطرے میں ڈالنے سے بھی بھارت کبھی نہیں چوکا۔ عوامی لیگ کے ہر دورِ حکومت میں بنگلا دیش کو بھارت کا بغل بچہ بنائے رکھنے پر بھرپور توجہ دی گئی۔ بھارت کی پالیسیوں نے بنگلا دیش کو کبھی پنپنے نہیں دیا۔ بھارتی قیادت کی بھرپور کوشش رہی ہے کہ بنگلا دیش کو اس قابل ہونے ہی نہ دیا جائے کہ وہ علاقائی اور عالمی سیاست میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل ہوسکے۔

گزشتہ برس اگست میں شیخ حسینہ واجد کی حکومت کا تختہ الٹ کر اُسے بھارت فرار ہونے پر مجبور کرنے والی طلبہ تحریک نے ملک کا نظم و نسق سنبھالا تو معاملات بہتر ہوئے ہیں۔ بنگلا دیش کے عوام اب بھارت کے خلاف ڈٹ گئے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں کہ اب پسپائی صرف تباہی لائے گی۔ بنگلا دیش میں انتخابات ہونے ہیں۔ عبوری انتظامیہ کے تحت جو اقدامات کیے جارہے ہیں، اُن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھارت کی بالادستی قبول کرنے کی ذہنیت اب بنگلا دیشیوں نے کھرچ کر پھینک دی ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے طور پر زندگی گزارنے پر کمر بستہ ہیں۔

زیرِ نظر مضمون پڑھ کر آپ کو بنگلا دیش کی موجودہ کیفیت کا بھرپور اندازہ ہوگا۔ بنگلا دیشی قوم اب بھارت کی بالا دستی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بھارت نے بنگلا دیش کی سرحدوں کو پامال کرنے میں بھی کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور بنگلا دیشی باشندوں کو دراندازی کے نام پر قتل کرتی رہی ہے۔ مگر اب اِس کی گنجائش نہیں کیونکہ ڈھاکا میں چُپ سادھ کر بیٹھی رہنے والی حکومت نہیں۔

خونیں لکیر تھی اور یہ لکیر اِس لیے خونیں تھی کہ بھارت نے دراندازی کا الزام لگا کر بنگلا دیشیوں کے قتل کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ عشروں تک بھارت کی بارڈر سکیورٹی فورس (بی ایس ایف) نے بنگلا دیشی باشندوں کو قتل کیا اور اس دوران بارڈر گارڈز آف بنگلا دیش (بی جی بی) خاموش تماشائی بنے یہ تماشا دیکھتے رہے کیونکہ ڈھاکا کی طرف سے باضابطہ سرکاری ردِعمل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پالیسی یہ تھی کہ بھارت چاہے کچھ بھی کرے، خاموشی اختیار کی جائے اور صرف تماشا دیکھا جائے۔ یہ ایسا دور تھا جس میں بی ایس ایف کو بظاہر اس بات کا لائسنس ملا ہوا تھا کہ جتنے بھی بنگلا دیشیوں کو مارنا چاہیں ماریں۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ احتساب تو بہت بعد کا مرحلہ تھا۔ شیخ حسینہ واجد کے ہر دورِ حکومت میں بنگلا دیش نے بھارت کے مقابل غلامانہ حیثیت قبول کی۔ نئی دہلی جو کچھ بھی کہتا تھا، اُسے ڈھاکا سَر جھکا کر سنتا تھا اور بلا چُوں چَرا قبول کرلیتا تھا۔ وہ دور اب لَد چکا ہے۔ جو قتل و غارت کا بازار گرم رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے تھے، وہ اب بنگلا دیش کے ایوانِ اقتدار سے نکالے جاچکے ہیں۔ پوری کی پوری لہر ہی پلٹ چکی ہے۔

آپ کو فیلانی خاتون یاد ہے؟ یہ ۱۵ سالہ لڑکی انتہائی بے دردی سے قتل کردی گئی تھی۔ ۲۰۱۱ء میں بی ایس ایف کے درندہ صفت اہلکاروں نے فیلانی خاتون کو محض اِس جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کہ وہ غلطی سے بھارتی علاقے میں چلی گئی تھی اور وہاں سے واپس آکر بنگلا دیش کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ معصوم فیلانی کا مُردہ جسم گھنٹوں خاردار باڑ پر لٹکا رہا۔ یہ بی ایس ایف کی سفاکی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ فیلانی کی لاش کی تصویر نے عالمی برادری کو سب سے بڑی نام نہاد جمہوریت کا اصل چہرہ دکھا دیا، اُس کی منافقت کُھل کر سامنے آگئی۔

بہت سوں کو یہ خوش فہمی لاحق تھی کہ عالمی برادری کی طرف سے جو بھی ردِعمل سامنے آئے گا، وہ بھارت کو گریبان میں جھانکنے کی تحریک دے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ جب کوئی طاقت کے نشے میں چُور رہتا ہے اور غرور و سرکشی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، تب باطن میں جھانکنے کی توفیق کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ بی ایس ایف سے یہ فضول توقع وابستہ کرلی گئی تھی کہ فیلانی خاتون کے واقعہ کے بعد وہ اپنے گریبان میں جھانکے گی اور انصاف یقینی بنانے کی کوشش کرے گی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوسکا۔ اِس کے بجائے بی ایس ایف مزید مظالم ڈھانے پر تُل گئی۔ ۲۰۰۰ء سے ۲۰۲۰ء کے دوران بی ایس ایف نے بنگلا دیش کے ۱۲۰۰ سے زائد باشندوں کو کسی جواز کے بغیر موت کے گھاٹ اتارا۔ اِن سب کا قصور صرف یہ تھا کہ کھیتی باڑی کے دوران یا جانوروں کو چَراتے ہوئے یہ غلطی سے بھارتی

علاقے میں داخل ہوگئے تھے یا بین الاقوامی سرحد کے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔

بھارتی میڈیا نے اس حوالے سے بہت گندا، بہت ہی گھناؤنا کردار ادا کیا۔ بے قصور اور غیر متعلق شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے عمل کو بھارتی میڈیا نے ہمیشہ درست قرار دیا۔ بھارتی میڈیا آؤٹ لیٹ یہ کہتے تھے کہ بی ایس ایف نے دراندازی کی کوششیں ناکام بناتے ہوئے بنگلا دیشیوں کو ہلاک کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ بی ایس ایف کے اہلکاروں نے بنگلا دیشی شہریوں کے ساتھ کیا، وہ کم و بیش ماورائے عدالت ہلاکت کے زُمرے میں آتا ہے۔ اِس دوران شیخ حسینہ واجد کی حکومت بھارت سے دوستی، تعاون اور تجارت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ جب بنگلا دیشی شہریوں کو کسی جواز کے بغیر قتل کیا جارہا تھا، تب شیخ حسینہ واجد کی حکومت بھارت سے پیاز اور اناج درآمد کر رہی تھی اور یہی سبب ہے کہ ڈھاکا کو اس پورے معاملے میں نئی دہلی سے احتجاج کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

بھارت کو عشروں کے دوران پہلی بار یہ جاننے کا موقع مل رہا ہے کہ بنگلا دیش اُس کا بغل بچہ ہے، نہ اُس کے پچھواڑے میں واقع کوئی ناکارہ سا قطعۂ اراضی۔ بھارتی قیادت کو اب احساس ہو چکا ہے کہ بنگلا دیش ایک آزاد و خود مختار ریاست ہے جو اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت قبول نہیں کرتی اور یہ بھی کہ اب بنگلا دیش کی آواز دبائی نہیں جاسکتی۔

بھارتی اسٹیبلشمنٹ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اپنی روایتی پلے بک کے مطابق ہی چل رہی ہے۔ بنگلا دیش میں جو کچھ بھی ہوا ہے اور جو تبدیلی رونما ہوئی ہے، اُسے انتہا پسندی اور انقلاب پسندی قرار دے کر داغدار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ واویلا بھی کیا جارہا ہے کہ بنگلا دیش اب اسلامی شریعت کے غیر لچکدار قوانین کے تحت کام کرنے والی ریاست میں تبدیل ہو جائے گا۔ مغربی دنیا کو یہ کہتے ہوئے ڈرایا اور بدگمان کیا جارہا ہے کہ بنگلا دیش پر مسلم انتہا پسندوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ بھارتی میڈیا ایسے تجزیے شائع کر رہا ہے جن میں یہ بات زور دے کر کہی جارہی ہے کہ بنگلا دیش میں بھارت مخالف جذبات پروان چڑھائے جارہے ہیں تاکہ دوستی اور اشتراکِ عمل کی راہیں بند ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض جذباتیت نہیں بلکہ خود مختاری کا معاملہ ہے۔ بنگلا دیش کے لوگوں نے اب کسی جواز کے بغیر بی ایس ایف کے ہاتھوں قتل ہونے سے انکار کردیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُنہیں مویشی اور کیڑے مکوڑے سمجھتے ہوئے نظر انداز نہ کیا جائے۔

کسی بھی ملک کی سرحد دراصل اُس ملک کی مجموعی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ایک زمانے تک بھارت اور بنگلا دیش کی سرحد نے بی ایس ایف کے ہاتھوں نوآبادیاتی رنگ پیش کیا۔ بھارت چاہتا ہے کہ بنگلا دیش دب کر رہے۔ شیخ حسینہ واجد کی شکل میں بھارت کو موم کی ناک مل گئی تھی کہ جس طرف بھی چاہو، موڑ دو۔ معاملہ یہ ہے کہ بنگلا دیش نئی سوچ کے ساتھ جی رہا ہے۔ وہ مزاحمت کرنا جانتا بھی ہے اور چاہتا بھی ہے۔ بھارت کی اسٹیبلشمنٹ سے یہ بات برداشت اور ہضم نہیں ہو پارہی۔ بنگلا دیش جنگ نہیں چاہتا۔ وہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ جوابدہی کا احساس پروان چڑھے۔ بھارت جو کچھ بھی کرتا ہے، اُس کا جواب بھی تو دینا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنگلا دیش اب دب کر نہیں رہنا چاہتا بلکہ پوری عزتِ نفس کے ساتھ جینے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ وہ بھارت کے جبر کو اپنی تقدیر سمجھ کر چلنے کے لیے تیار نہیں۔ ڈھاکا اب کھل کر بول رہا ہے۔ اُس میں اعتماد ہے۔ اب اُسے کھل کر بولنے کے لیے کسی کی اجازت درکار نہیں۔

کو نام نہاد استحکام خون کی ڈوبی ہوئی سرحد اور خاموش کرائے جانے والے احتجاج کی قیمت پر ملا۔

بھارتی قیادت اور شیخ حسینہ واجد نے سوچ لیا تھا کہ یہ سب کچھ یونہی چلتا رہے گا مگر جس طرح ہر بُری اور گھٹیا چیز کی کوئی نہ کوئی ایکسپائری ڈیٹ ہوتی ہے، بالکل اُسی طرح بھارت اور شیخ حسینہ گٹھ جوڑ کی بھی ایکسپائری ڈیٹ تھی۔ یہ ڈیٹ آئی تو معاملات ختم ہوگئے اور ایک نیا بنگلا دیش اُبھر کر سامنے آگیا۔

شیخ حسینہ واجد کے ادوارِ حکومت کے دوران بنگلا دیش کی مجموعی کیفیت انتہائی مایوس کن تھی۔ لوگ سہمے ہوئے رہتے تھے۔ اگست ۲۰۲۴ء میں شیخ حسینہ اور عوامی لیگ کے اقتدار کا خاتمہ محض سیاسی تبدیلی نہ تھا، بلکہ یہ عوام کے لیے نفسیاتی آزادی کے بھی مترادف تھا۔ شیخ حسینہ کی رخصتی اُس غلامی کا بھی خاتمہ تھی جو بنگلا دیش نے اپنے اوپر خود مسلط کی تھی۔ پہلے تو لوگ صرف بولتے تھے، احتجاج کرتے تھے مگر اِس بار اُنہوں نے جو کہا، وہ کر دکھایا۔ بنگلا دیش میں نئی قیادت نئے لہجے کے ساتھ آئی۔ سرحد پر ہونے والی ہلاکتوں پر پہلے پھیکی بلی کا سا ریسپانس ہوتا تھا اور چند روایتی مذمتی جملوں کو کافی سمجھ لیا جاتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اِس بار طے کرلیا گیا کہ بھارت کے لیے معاملات ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' جیسا ہوگا۔ اب اِن ہلاکتوں پر زوردار احتجاج کیا جاتا ہے اور سفارتی سطح پر جواب دینے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ آج بنگلا دیش میں بھرپور سیاسی عزم پایا جاتا ہے۔ عوام کے اعتماد اور سیاست دانوں کے ارادوں نے مل کر بھارت کو باور کرادیا ہے کہ اب اگر اُس نے کچھ ایسا ویسا کچھ کیا تو انتہائی سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مہر پور میں بی ایس ایف کے چند اہلکاروں نے بنگلا دیشی علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو لوگوں نے اُن پر پتھراؤ کیا اور نعرے لگائے۔ چپائی نواب گنج میں مقامی لوگ مل کر بین الاقوامی سرحد پر نظر رکھتے ہیں اور کسی کو بنگلا دیش میں داخل ہونے نہیں دیتے۔

شیخ حسینہ کے بعد کے بنگلا دیش میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اسکول کی طالبہ سورنا داس کو بی ایس ایف اہلکاروں نے اغوا کرکے سفاکی کا نشانہ بنایا تو نیم دلانہ سفارتی ردِعمل کی طرح بہت وقت نہیں لگا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے بھرپور شور اٹھا۔ بھارت سے کارروائی کا مطالبہ کیا گیا اور وہ بھی نرمی سے نہیں بلکہ پوری طاقت سے، زور دے کر۔ بھارتی قیادت کو اب

کبھی بھارت بی ایس ایف کو اپنی طاقت کی ایک نمایاں علامت کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اب اشتراکِ عمل کی بات کر رہا ہے۔ بنگلا دیش انتقام نہیں لینا چاہتا بلکہ احترام چاہتا ہے۔ وہ پورے وقار کے ساتھ جینا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ بھارت کی قیادت کو بھی احساس ہو چکا ہے کہ جو کچھ اب تک ہوتا آیا وہ مزید نہیں چل سکتا۔ بنگلا دیش کو بھی اپنی سرزمین کی حفاظت کا حق حاصل ہے۔ اگر اسرائیل اور بھارت طاقت استعمال کر سکتے ہیں تو بنگلا دیش بھی ایسا کر سکتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ بنگلا دیش قانونیت کی طرف چلا گیا ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ وہ اپنی بات منوانا چاہتا ہے اور کسی کے جبر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب بھی کسی کمیونٹی کو دھکیل کر دیوار سے لگایا جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کسی کمیونٹی کے لیے بقا کا سوال کھڑا کر دیا جاتا ہے تب مزاحمت بھی شدید نوعیت کی پیدا ہوتی ہے اور معاملات بگڑتے ہیں۔ بنگلا دیش بھی اب خود کو منوانا چاہتا ہے اور اپنے لیے بقا کا سوال کھڑا کرنے والوں کے سامنے کھڑا ہونا چاہتا ہے۔

بھارت نے عشروں تک بنگلا دیش کو انگوٹھے تلے دبا کر رکھا مگر اب یہ سب کچھ نہیں چل سکتا۔ بی ایس ایف کو ہتھیار بنا کر بنگلا دیش کو دھمکانے کی پالیسی مزید جاری نہیں رکھی جا سکتی۔ بنگلا دیش جاگ چکا ہے۔ بنگلا دیش اب کسی بھی نوع کا جبر برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ایک مدت تک خاموش رہے۔ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتے اور پہلے بھی اُنہیں خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔

فیلانی خاتون اور دوسرے بہت سے بلکہ سیکڑوں شہیدوں کی روحیں سوال کرتی ہیں۔ جو کچھ پہلے سرگوشیوں کی شکل میں کہا جاتا تھا، وہ اب کھل کر کہا جا رہا ہے۔ بنگلا دیش کے عوام اب کچھ بھی دبی زبان میں نہیں کہنا چاہتے۔ بھارت کو بھی اندازہ ہے کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ نیا بنگلا دیش ساتھ کھڑا ہے۔ اب وہ بی ایس ایف کے ذریعے جبر ڈھانے کے بجائے اشتراکِ عمل اور دوستی کی بات کر رہا ہے۔ بی ایس ایف کے اہلکاروں کو شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ یہ مزاحمت بنگلا دیشی فورسز کی طرف سے بھی ہے اور عوام کی طرف سے بھی۔ بنگلا دیش کے عوام اور فورسز کے جوان اب بنگلا دیش کی حدود میں آنے والے بی ایس ایف کے اہلکاروں کو پکڑ بھی لیتے ہیں اور اُن کے ہتھیار بھی چھین لیتے ہیں۔ ایسے کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں جو بھارتی قیادت کو بھرپور پیغام پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ ایک ایسی وڈیو بھی وائرل ہوئی ہے جس میں بی ایس ایف کے اہلکار کو لوگوں نے پکڑ لیا ہے اور وہ پیر پکڑ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ یوں بھی ہوا کہ بنگلا دیشی کسانوں کو پکڑ لیا گیا تو جواب میں بھارتی باشندوں کو پکڑ لیا گیا اور پھر فلیگ اسٹاف میٹنگ میں شہریوں کا تبادلہ ہوا۔ بنگلا دیش کے سرحدی دیہات میں رہنے والے اب دبنے کے لیے تیار نہیں اور اپنی طاقت منوانا چاہتے ہیں۔ ضرورت نہیں کہ گولی کا جواب گولی سے دیا جائے۔ جواب دینے کے اور بھی بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں اور بنگلا دیش کے عوام اپنی فورسز کے ساتھ مل کر وہی طریقے اپنا رہے ہیں۔ بنگلا دیشیوں نے بھارتی قیادت کو پیغام دے دیا ہے کہ جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا، اب وہ سب کچھ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے۔ بہت کچھ وڈیوز کی شکل میں محفوظ کیا جا سکتا ہے اور بعد میں ثبوت کے طور پر بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ بی ایس ایف کے جبر کا زمانہ جا چکا۔ اب بنگلا دیش کو دبا کر، کچل کر رکھنا ممکن نہیں۔ عالمی برادری کا ردِعمل اپنی جگہ، بنگلا دیش نے یہ بڑی مثبت تبدیلی اپنے زورِ بازو سے پیدا کی ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"BSF's era of intruding into Bangladesh draws to a close". ("The Daily Star" Dhaka. May 5, 2025)

بقیہ: پروفیسر خورشید احمد: روشن یادیں!

کمی کو کبھی نفسیاتی مسئلہ نہیں بننے دیا ہے اور اس کے ایک ایک فرد نے ہزار ہزار انسانوں کی سی عزیمت کو سر کا تاج بنایا۔ تربیت، تنظیم اور جہدِ مسلسل کو زندگی اور زندگی کی معراج بنایا ہے۔ اس روایت کے آخری فرد تو بلاشبہ خاکی وجود میں خورشید احمد صاحب تھے، مگر الحمدللہ، وہ قافلہ نئے آہنگ اور نئے میدانوں میں، نسلِ نو کے ساتھ معرکہ زن ہے، ع

اِک روشنی کے ہاتھ میں ہے روشنی کا ہاتھ

اکثر دن کے تین سے چار بجے کے درمیان پروفیسر صاحب کے فون کا انتظار رہتا تھا۔ اب اس مہربان ہستی کا فون نہیں آئے گا۔ دُنیا کی اسکرین سے بھی انسان اسی طرح چلا جاتا ہے، رہ جاتی ہے اس کی یاد اور صدقۂ جاریہ۔ کاش! ہم صدقۂ جاریہ بن سکیں اور مہلتِ عمر کو اس دُنیا کی باثمر زندگی اور آخرت کی کامیابی زندگی بنا سکیں۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''عالمی ترجمان القرآن'' لاہور۔ مئی ۲۰۲۵ء)

○○○

بقیہ: پاکستان: جوہری طاقت کا حصول آسان نہ تھا!

میں ایک اہم کردار ادا کیا جسے ضمیر اکرم روشن بصیرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کی کتاب کا ایک اہم موضوع یہ ہے کہ اپنے جوہری اور میزائل پروگرام کو آگے بڑھاتے ہوئے پاکستان کی سفارت کاری نے مغرب کے امتیازی رویے کا سامنا کیا۔

بطور سفارت کار میں خود بین الاقوامی دباؤ کی شاہد ہوں۔ پاکستان سے کہا گیا کہ وہ یکطرفہ طور پر ٹیسٹ پر پابندی کے معاہدے پر دستخط کرے، اپنی جوہری تنصیبات کے معائنے پر رضامند ہو، اقوام متحدہ کی تخفیف اسلحہ کی کانفرنس میں فیزائل میٹریل کٹ آف ٹریٹی کے لیے مذاکرات پر دستخط کرے اور اپنے میزائل بنانے کے سلسلے کو روکے۔ پاکستان نے اپنے سلامتی کے مفادات کے تحفظ کے لیے مذکورہ بالا تمام مطالبات سے انکار کیا۔

انہیں فیصلوں اور بے مثال کوششوں کی وجہ سے پاکستان نے اسٹریٹجک صلاحیت پیدا کی تاکہ بھارت کی جانب سے جنگ چھیڑے جانے پر پاکستان اپنی سلامتی کا تحفظ کر سکے۔

ملک کے اندرونی چیلنجز سے نمٹنے کے لیے بھی اسی طرح کی ثابت قدمی کی ضرورت ہے، بالخصوص ایک مضبوط، خود انحصار معیشت بنانے کے لیے مضبوط عزم کا اعادہ کرنا ہوگا تاکہ ہمارا ملک کسی بھی قسم کے بیرونی دباؤ کی زد میں نہ آئے۔

"The nuclear factor".
(Daily "Dawn" Karachi. May 12, 2025)

بقیہ: پروفیسر صاحب کی کشمیر سے قلبی وابستگی

مطالعے کا ذوق بھی وہ دوسروں میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اسلام آباد کی مشہور دکان 'مسٹر بکس' سے اگر کوئی اچھی کتاب انڈیا، پاکستان یا کشمیر پر دیکھتے تو خرید کر راؤ اختر صاحب کے ذریعے مجھے بھی بھیج دیتے۔ ایک دو بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں میری تحریر کا حوالہ بھی دیا۔ شاید یہ ان کی طرف سے حوصلہ افزائی کا ایک خاص انداز تھا، جو آج بھی یاد آتا ہے۔

اگرچہ پروفیسر خورشید احمد آسودۂ خاک ہو چکے، مگر ان کی درجنوں کتابیں، بے شمار شاگرد، قائم کردہ ادارے اور فلاحی منصوبے ہمیشہ ان کی یاد کو زندہ رکھیں گے۔ وہ اپنے پیچھے ایک ایسا علمی و فکری سرمایہ چھوڑ گئے ہیں، جو ان کے لیے صدقۂ جاریہ کی صورت میں ان کی قبر کو روشن اور آخرت میں ان کے لیے نجات و کامیابی کا سامان بنے گا، ان شاءاللہ!

(بحوالہ: ماہنامہ ''عالمی ترجمان القرآن'' لاہور۔ مئی ۲۰۲۵ء)

○○○

پاکستان اور بھارت کے درمیان بے اعتمادی

عارفہ نور

پاکستان اور بھارت ایک خوفناک تنازع کے دہانے سے واپس لوٹے ہیں۔ اس تنازع کا اختتام جانا پہچانا تھا جہاں امریکا نے مداخلت کی لیکن دونوں ممالک کو یہ نہیں لگتا کہ بحران واقعی میں ختم ہو چکا ہے۔ تاہم بہت سے نتائج فی الوقت ڈی جی ایم اوز کی بات چیت (جو تادمِ تحریر ہونا باقی ہے) پر منحصر ہیں۔

درحقیقت بات چیت اور اعلامیے کے بعد بھی حالات بدلتے رہیں گے اور جیسا کہ ہم صحافتی زبان میں کہتے ہیں، یہ ایک 'ایسی صورتحال ہے جس میں مسلسل پیشرفت ہوتی رہے' گی اور حقائق اور تجزیے نامکمل رہیں گے۔ یہ تحریر بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ پھر بھی میں کچھ مسائل کو سیاق وسباق میں پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

اشارے بتا رہے ہیں کہ جنگ بندی کی پاسداری کرنا آسان نہیں ہوگا۔ دونوں ممالک کے درمیان بے اعتمادی کی اصل وجہ برقرار ہے جبکہ دونوں کو لگتا ہے کہ ان کے ساتھ غلط ہوا ہے۔

ہمسایہ ملک کا مزاج ایک اور اہم عنصر ہے۔ وہاں چند حلقے بھارتی حکومت پر مشن ادھورا چھوڑنے پر تنقید کے نشتر برسا رہے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں میں گمان ہے کہ صورتحال بدلے گی۔ پلوامہ واقعہ کے برعکس، گمان ہوتا ہے کہ نئی دہلی کے لیے اپنے عوام کو اس بات پر آمادہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ جنگ بندی ہی درحقیقت ان کی کامیابی ہے۔ وائٹ ہاؤس جو جنگ بندی میں اپنے کردار کا دعویٰ کر رہا ہے اور جشن منا رہا ہے، اس نے بھی مودی حکومت پر تنقید میں اضافہ کیا ہے۔ آنے والے دنوں میں یہ دیکھنا اہم ہوگا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی حکومت اس پورے معاملے سے کیسے نمٹتی ہے۔

تاہم پاکستان میں جشن کا ماحول ہے۔ لیکن بہت سی وجوہات ہیں کہ جن کی بنا پر جنگ کا جشن کبھی بھی نہیں منانا چاہیے کیونکہ فتح بھی قیمتی انسانی جانوں کے ضیاع اور خاندان اجڑنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جنگ کوئی شاندار فعل نہیں ہے۔

جنگ بندی کو برقرار رکھنے کے لیے بھی عوام کو تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سرحد پار مزاج انتہائی گرم ہے اور حالیہ تنازع نے ایک انتہائی اہم چیز واضح کی ہے، جو یہ ہے کہ مستقبل میں بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی صرف لائن آف کنٹرول پر ہونے والی جھڑپوں تک محدود نہیں رہے گی۔ لگتا ہے کہ اب ڈورن، فضائی حملے اور بہت کچھ استعمال ہوگا۔ اور ان میں سائبر حملے بھی شامل ہوں گے۔ خفیہ کارروائیوں کے ساتھ ساتھ یہ سب بھی پاک۔ بھارت تعلقات میں متعدد چیلنجوں کا باعث بنیں گے اور اس کا سب سے بڑا شکار عوام ہوں گے۔

پاکستان کو اب مستقبل میں وقتاً فوقتاً بھارت کے ساتھ جارحیت اور جنگی حالات کے لیے کمر کس لینی چاہیے۔ حریف ۲۰۱۶ء سے اب تک شدت پسندی کے ایک مخصوص پیٹرن پر چلا ہے۔ ۹ سال قبل نئی دہلی نے ایل او سی پر اسٹرائیک کی تھی۔ بہت سے لوگوں نے استدلال کیا کہ اس طرح کی اسٹرائیکس معمول کی بات ہیں حالانکہ بھارت کا تردید کرنے کے بجائے عوامی سطح پر ان اسٹرائیکس کا اعتراف کرنا غیر معمولی تھا۔

پلوامہ/بالاکوٹ اسٹرائیکس میں بھارت نے ایل او سی عبور کر کے پاکستان کی حدود میں حملے کیے۔ نتیجتاً پاکستان نے بھی فضائی حملے سے ہی جواب دیا۔ ۶ سال بعد بھارت نے اپنی اسٹرائیکس میں شہریوں، سویلین اور ملٹری اہداف کو نشانہ بنایا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بھارت نے اب یہ اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔

ابھی یہ واضح نہیں کہ آیا نئی دہلی پر ۲۰۲۵ء میں جو کچھ ہوا، اس سے بھی بڑا کچھ کرنے کے لیے دباؤ ہوگا یا نہیں۔ لیکن اب ایل او سی یا سرحد کے پار فوجی حملوں کو بھارت کے زیرِ قبضہ کشمیر میں ہونے والی کسی بھی دہشت گردی کے ردعمل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان کو اس حوالے سے غفلت نہیں برتنی چاہیے کہ مزاحمت کا توازن قائم ہو چکا ہے، جیسا کہ فرض کیا جا رہا ہے۔ اس کے بجائے دونوں ممالک یہ ثابت کر چکے ہیں کہ جوہری جنگ تک پہنچے بغیر بھی خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے تنازعات کو اتنا سنگین رخ دیا جا سکتا ہے۔

ایک اور عنصر ہے جس کی خوشی منانے کے بجائے اسے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اور وہ تنازع کے دوران پاکستان کا اندرونی اور بین الاقوامی سطح پر ابلاغ ہے۔ کچھ غلطیوں کے باوجود (جو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے) مجموعی طور پر پاکستان کی کارکردگی اچھی رہی۔ اگرچہ پریس کانفرنسز بہت زیادہ ہوئیں لیکن بین الاقوامی سطح پر مؤثر انداز میں مؤقف پیش کیا گیا۔ یہ واضح اس لیے بھی تھا کیونکہ بھارت بہت کم ہی عالمی میڈیا میں اپنا مؤقف پیش کرتا نظر آیا۔

لیکن اثر انگیزی کا براہ راست تعلق حقائق سے تھا، جس نے اسلام آباد کو اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا۔ بھارت جارح تھا اور ایسے میں پاکستان اپنا دفاع کرے گا۔ اور پھر پاک فضائیہ نے بھارتی طیارے گرا کر ایسی شاندار فتح حاصل کی جس کی نئی دہلی تصدیق بھی نہیں کر سکا۔ اس سے اسلام آباد کے مؤقف کو مزید تقویت ملی۔

ملک میں بعض لوگوں کی ناراضی کے خدشے کے پیشِ نظر ہمیں کارگل کو یاد کر لینا چاہیے۔ کچھ حقائق کا دفاع کرنا اتنا مشکل ہوتا ہے کہ اچھی کارروائیاں بھی ان پر پردہ نہیں ڈال سکتیں۔ ہم صرف امید کر سکتے ہیں کہ اس کامیابی سے پاکستان کو یہ سبق بھی ملے گا کہ وہ دنیا کو اپنے ہر مؤقف پر قائل نہیں کر سکتا۔ 'تحمل' کی پالیسی کو برقرار رکھنا ضروری ہے حالانکہ اندرونِ خانہ کچھ حلقے اب اس پر تنقید کرنے لگے ہیں۔

'تحمل' کا لفظ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس حالیہ کامیابی سے حکومت کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ یہ اپنے ملک میں 'ہارڈ اسٹیٹ' کے مزید سخت ہونے کا وقت ہے۔ آخرکار ہمارے ہمسائے نے بھی اس مفروضے پر یقین کیا کہ پاکستان کے اندرونی مسائل اور تقسیم اسے 'مناسب جواب' دینے سے روکیں گے جو کہ غلط ثابت ہوا۔ تاہم یہ سمجھنا اب بھی ضروری ہے کہ مزید جھڑپوں کے امکان کے پیشِ نظر، اندرونی مسائل حل کرنا زیادہ ضروری ہے۔ یہ سیاسی صورتحال بالخصوص بلوچستان کے معاملے میں سچ ہے۔ یہ ہماری سب سے کمزور فالٹ لائن ہے جس کا استحصال کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ اگر اسے محفوظ بنانا ہے تو سیاسی حل تلاش کرنا ہوگا۔ اور ساتھ ہی معیشت پر بھی سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۵ء میں ہونے والی پاک۔ بھارت جھڑپوں کا اختتام کیسے ہوا، پڑوسی حکومت کی مالی حیثیت اسے اس طرح کی محدود محاذ آرائی کے لیے مستقبل میں بھی متحرک کرے گی۔ اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بہتر ہوگا کہ پاکستان بھی اپنی معیشت کو مضبوط، مستحکم بنائے اور قرضوں پر اپنا انحصار کم کرنے پر توجہ دے۔

آخری لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ حالیہ تصادم پاکستان بامقابلہ بھارت کم بلکہ چینی بامقابلہ مغربی ساختہ ہتھیاروں کے حوالے سے زیادہ تھا۔ اگرچہ پاک فضائیہ کی کامیابی سے پاکستان اور چین کے درمیان تعلقات مضبوط ہوں گے لیکن یہ اندازہ لگانے میں وقت لگے گا کہ بین الاقوامی اور علاقائی سطح پر اس کا کیا مطلب ہے۔ امید کرتے ہیں کہ یہ دفاعی تعاون اس نوعیت کی اسکروٹنی کا شکار نہ ہو جو حالیہ برسوں میں سی پیک کی صورت میں ہم نے دیکھا۔

"A difficult neighbourhood".

(Daily "Dawn" Karachi. May 13, 2025)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950